طلوع اسلام

مارچ 1972

بتقریب یوم پاکستان

قائد اعظم کا ارشاد

(حیدرآباد - دکن میں)

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک

پاکستان

سالانہ ـــــــ دس روپے

غیر ممالک

سالانہ ـــــــ ایک پونڈ

ٹیلی فون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت کا پتہ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ

نمبر (۳)

مارچ ۱۹۷۲ء

جلد (۲۵)

فہرست

(۱) لمعات ۔۔۔ ۲

(۲) طلوعِ اسلام کا لج فنڈ (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ) ۔۔۔ ۲۳

(۳) تحریکِ پاکستان کی کہانی (۷) ۔۔۔ ۲۵

(۴) نہ جلالِ پادشاہی نہ جمہوری تماشا (محترم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب) ۔۔۔ ۴۴

(۵) حقائق و عبر ۔ (آہ بچاری اسلامی حکومت ؛ یہ کونسے قرآن کی آیت ہے ؛ پاکستانی تہذیب ؛ اب فرمائیے کیا ارشاد ہے ؛ جو حربہ کام دے جائے ؛ سوشلزم اور اخلاقی اصلاح ؛ صدر بھٹو کی خدمت میں ؛ ملحد و بے دین قیادت) ۔۔۔ ۵۳

(۶) رسول اللہؐ اور تعددِ ازواج (محترم سید یعقوب شاہ صاحب) ۔۔۔ ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل ، ناشر سراج الحق ۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور ۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف ۔ مطبوعہ اشرف پریس ۔ ایبک روڈ ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

غنیمت ہے کہ مجیب کے نشۂ قوت کی بدمستیوں نے، خوش فہمیوں کے ان پردوں کو چاک کرنا شروع کر دیا ہے، جن میں مغربی پاکستان کے بعض زعماء مبتلا چلے آ رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان فریب کاریوں کے نقاب بھی اٹھنے شروع ہو گئے ہیں جن کے جال میں یہاں کے تخریبی عناصر سیدھے سادے عوام کو پھنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم نے مجیب کے متعلق کہا تھا اور ایک بار نہیں بار بار کہا تھا کہ یہ شخص بدترین غدار ہونے کے علاوہ انتہائی کینہ توز ہے اور اس کے ساتھ ہی بدتمیز اور محسن کش بھی۔ چنانچہ اس نے صدر بھٹو کے متعلق یہ کہہ کر کہ اگر مسٹر بھٹو یہ سمجھتا ہے کہ وہ (مجیب) پاکستان کے ساتھ کسی قسم کا تعلق بالواسطہ رکھیگا، تو وہ (مسٹر بھٹو) دیوانہ ہے۔ اسے پاگل خانے بھیجدینا چاہیئے' اپنے سینے میں دبائی ہوئی آگ کو لاوے کی طرح اگل دیا ہے۔ اس کے "بنگلہ دیش" میں غیر بنگالیوں پر (جنہیں وہ بہاری کہہ کر پکارتا ہے) جو قیامت ٹوٹ رہی ہے اور جس طرح ان کا سب کچھ لٹ رہا ہے' اس سے اب ساری دنیا واقف ہو چکی ہے۔ لیکن اس کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ وہ اعلان کر رہا ہے کہ وہاں ایک بہاری کو بھی قتل نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس وہ مسلسل چلائے جا رہا ہے کہ مغربی پاکستان کی فوج نے تیس چالیس لاکھ بنگالیوں کو قتل کر دیا ہے۔ اس پر مستزاد' "بنگلہ دیش" کا صدر آہ و فریاد کر رہا ہے کہ مغربی پاکستان میں بسنے والے بنگالیوں پر انتہائی مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ انہیں بچانا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں مجیب نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ "بنگلہ دیش" میں بسنے والے (قریب بیس لاکھ) "بہاریوں" کو پاکستان سنبھال لے اور یہاں کے (قریب چار لاکھ) بنگالیوں کو ادھر بھیجدیا جائے۔ ذرا اس تجویز کی "معقولیت" پر غور کیجئے کہ "بنگلہ دیش" میں بسنے والے بہاریوں (یعنی غیر بنگالیوں) کو مغربی پاکستان لے لے۔ سوال یہ ہے کہ یہ "بہاری" ہیں کون جنہیں مجیب ادھر منتقل کرنا چاہتا ہے؟ مجیب کا دعویٰ ہے کہ اس نے "بنگلہ دیش" نامی ایک آزاد مملکت قائم کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس مملکت کی حدود میں بسنے والے' تمام افراد اُس مملکت کے شہری ہیں۔ کیا آپ نے اس کی مثال کہیں اور بھی دیکھی ہے کہ ایک مملکت کسی دوسری مملکت سے کہے کہ تم ہماری آبادی کے ایک حصے کو اپنے ہاں بسالو! پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ ان بہاریوں کا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں انہیں اس طرح دیس نکالا دیا جا رہا ہے؟ یہ کہ وہ بنگالی نسل سے نہیں۔ بالفاظ دیگر مجیب صاحب نے ایک ایسی آزاد مملکت قائم کی ہے جس میں صرف ایک نسل (بنگالی) کے افراد آباد ہو سکتے ہیں۔ غیر بنگالی اس مملکت کی حدود میں نہیں رہ سکتے۔ یعنی مجیب کی مملکت میں ہندو بنگالی تو رہ سکتے ہیں، مسلمان غیر بنگالیوں کے لئے وہاں کوئی گنجائش نہیں۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ وہ مغربی پاکستان سے کیوں کہہ رہا ہے کہ ان غیر بنگالیوں کو سنبھال لو! ظاہر ہے کہ ان

میں اور مغربی پاکستان میں اس کے سوا اور کوئی قدر مشترک ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ اور اگر اس کے مطالبہ کی بنیاد یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں بسنے والے غیر بنگالی، پاکستان کے شہری تھے اس لئے پاکستان اپنے شہریوں کو واپس لے جائے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک مشرقی پاکستان میں بسنے والے بنگالی مملکتِ پاکستان کے شہری نہیں تھے۔ اور یہی ہے وہ اصل راز جسے وہ چوبیس سال سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ (اور مشرقی پاکستان کے دیگر بنگالیوں) کو کبھی پاکستانی نہیں سمجھا۔

اب آپ سوچئے کہ ایک ایسے شخص سے، جس کے احساسات و عواطف اور ذہنیت یہ ہو، پاکستان کے لئے کسی قسم کے جذبہ خیر سگالی کی توقع رکھنا خوش فہمی یا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے عافیت اسی میں ہے کہ ہم اس حقیقت کا دل سے اعتراف کریں کہ مشرقی پاکستان اب پاکستان کا حصہ نہیں رہا، اور وہ مملکتِ پاکستان کا بھارت سے بھی زیادہ دشمن ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے اس کی تحقیق ضرور کیجئے۔ لیکن اس حقیقت کو اپنا لیجئے کہ یہ ایک حادثہ ہے جو ہو چکا۔ ایک واقعہ ہے جو گزر چکا۔ اصل یہ ہے کہ ہماری تباہیوں کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے ہمیشہ حقائق کا سامنا کرنے سے گریز کیا اور اپنے آپ کو خوش فہمیوں کی خواب آور گولیوں کا عادی بنائے رکھا۔ اگر ہم نے اس عادت کو اب بھی نہ چھوڑا تو یاد رکھئے۔ ہم تباہیوں کے اس سے بھی زیادہ عمیق گڑھوں میں جا گریں گے جہاں سے ہماری آواز تک بھی اوپر نہ آ سکے گی۔

ذرا سوچئے کہ یہ کتنی بڑی سحر آفریں خوش فہمی تھی کہ اگر بھارتی فوجیں "بنگلہ دیش" سے نکل جائیں تو مجیب ہم سے آزادانہ بات چیت کرنے کے قابل ہو جائے گا! پہلے تو یہ سوچئے کہ اگر بھارتی فوجیں "بنگلہ دیش" سے نکل جائیں تو کیا وہ ٹمبکٹو چلی جائیں گی جہاں سے وہ "بنگلہ دیش" واپس نہیں آ سکیں گی! وہ "بنگلہ دیش" سے نکل کر سرحدوں پر جا کھڑی ہوں گی۔ اور اگر اس سے بھی پیچھے چلی جائیں، تو بھی انہیں "بنگلہ دیش" کے اندر آنے میں دیر کتنی لگے گی۔ اس سے بھی آگے یہ کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اب مجیب کسی صورت میں بھی اپنے آپ کو آزاد تصور کر سکتا ہے یا کر سکے گا؟ مجیب اور اس کے ساتھ پورے کے پورے مشرقی پاکستان کی آزادی ختم ہو چکی ہے۔ وہ بھارت کے غلام ہو چکے ہیں اور بھارت کے غلام رہیں گے۔ ان سے کسی آزادانہ فیصلے کی توقع، امید موہوم ہے۔

اور فرض کر لیجئے کہ مجیب، کوئی فیصلہ آزادانہ کر سکتا ہے۔ تو کیا اس شخص سے آپ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ پاکستان سے خیر خواہی کے تعلقات وابستہ کر لے گا! ایں خیال است و محال است و جنوں!

اور مجیب جس بھارت کے پنجرے میں محبوس ہے۔ اس کی حالت یہ ہے کہ "اندرا دیوی" قریب ایک لاکھ پاکستانی فوجی قیدیوں کو "بنگلہ دیش" سے نکال کر اپنی تحویل میں لے جا چکی ہے تاکہ مجیب ان کے متعلق کوئی فیصلہ از خود کر ہی نہ سکے۔ وہ ان کی واپسی کے متعلق، تمام بین الاقوامی قواعد و ضوابط کو ردی کی ٹوکری میں پھینک کر، ہم سے وہ شرطیں منوا رہی ہے جنہیں ہم میدانِ جنگ میں بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ نہ ہو سکتے ہیں۔

مملکت کا آدھا حصہ جو ہم سے چھن ہی نہیں گیا بلکہ بدترین دشمن بن گیا۔ ایک لاکھ کے قریب جنگی قیدی بھارت جیسے کمینے دشمن کے قبضہ میں۔ بیس لاکھ کے قریب غیر بنگالی بنگالیوں کے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لئے تختۂ مشق۔ مغربی پاکستان کی سرحدوں پر دشمن کی فوجوں کا ہجوم اور ان میں نت نئے اضافے ——— اور ادھر ملک کے اندر تخریبی عناصر تازہ دم ہو کر دشمن نواز سرگرمیوں میں مصروف۔ عصرِ حاضر میں دشمن کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ حریف کے ملک میں پہلے انتشار و خلفشار

پیدا کر دیا جائے اور اس کے بعد اس پر حملہ کر دیا جائے۔ وہ خلفشار پھیلانے کے لئے خود نہیں آتا۔ اپنے ایجنٹ بھیجتا ہے۔ وہ قوم میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں۔ بددلی پھیلاتے ہیں۔ ایسی سرگوشیاں کرتے ہیں جن سے خوف و ہراسانی عام ہو جائے۔ ہر ایک کے دل میں عدم تحفظ (INSECURITY) کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ دشمن کی قوت کو بڑھا چڑھا کر اور اپنی قوت کو کمتر سے کمتر شکل میں دکھایا جاتا ہے تاکہ عوام کے دل میں یہ خیال پیوست ہو جائے کہ ہم دشمن کا مقابلہ کرنے کے قابل ہی نہیں۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ دشمن جن شرائط پر بھی رضامند ہو' اس سے مصالحت کر لی جائے۔ اس کے ساتھ اپنی فوج کے متعلق اس قسم کی افواہیں پھیلائی جائیں جن سے قوم کے دل سے فوج کا احترام اور اعتماد اٹھ جائے۔ جب ملک میں اس قسم کی فضا عام ہو جائے تو پھر وہ ملک بغیر جنگ کئے' دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور اگر جنگ کرنے کی نوبت بھی آ جائے' تو پہلے ہلے میں ہی ہتھیار رکھ دیتا ہے۔ اس لئے کہ فوج کی قوت کا انحصار اس کے پیچھے زیادہ قوم پر ہوتا ہے۔ فوج اور قوم کی مثال انڈے کی سی ہوتی ہے۔ فوج کو انڈے کا خول یا چھلکا سمجھئے اور قوم کو اس کے اندر کی سفیدی' زردی۔ اگر انڈہ اندر سے کچا ہو تو اس کا خول ذرا سی ٹھوکر سے پاش پاش ہو جاتا ہے لیکن اگر انڈہ سخت ابلا ہوا ہو تو اس کا خول اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ غداروں کے لباس میں چھپے ہوئے دشمن کے آلہ کار ایجنٹوں کا مشن یہ ہوتا ہے کہ وہ انڈے کو کچا رکھیں تاکہ اس کا خول اس کے ذرا سے جھٹکا دینے سے ٹوٹ جائے۔

جہاں تک غداروں اور بیرونی قوتوں کے ایجنٹوں کا تعلق ہے' ہماری روش کچھ عجیب سی چلی آ رہی ہے۔ تشکیل پاکستان کے تھوڑے ہی دنوں بعد مملکت کے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علیخان مرحوم نے اعلان کیا کہ ملک میں دشمنوں کے ایجنٹ تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ ان سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ اگر حکومت کو ان ایجنٹوں کا علم ہے تو (۱) ان کے خلاف باضابطہ ایکشن لیا جائے۔ اور (۲) قوم کو ان سے شناسا کرایا جائے تاکہ یہ ان سے محتاط رہ سکے۔ لیکن حکومت کی طرف سے نہ وہ کیا گیا نہ یہ۔ اور اس کے بعد ہر حکومت اسی قسم کے اعلانات کرتی رہی۔ ہم (اور ہمارے ساتھ دیگر بہی خواہان ملت) ہر بار یہ مطالبہ کرتے رہے کہ خدا کے لئے ان غداروں کی نشاندہی کیجئے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچائیے۔ لیکن کسی حکومت نے اس باب میں کچھ نہ کیا۔ کیا یہ تماشہ (اور تحیر انگیز اور عبرت آموز تماشہ) نہیں کہ اس مملکت میں (غداروں کی موجودگی کے مسلسل اعلانات کے باوجود) آج تک کسی غدار کو غداری کی سزا نہیں ملی! قوم نے آج تک کسی غدار کو پھانسی کے تختے پر لٹکتے نہیں دیکھا۔ اس کے برعکس غداروں کو کھلی چھٹی دی جاتی رہی کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتے رہیں۔ مجیب کے خلاف غداری اور بغاوت کے الزام میں (اگرتلہ کیس) چلا۔ اس کی عدالتی کارروائی ہنوز جاری تھی کہ بڑے بڑے زعمائے ملت نے پورا دباؤ ڈال کر نہ صرف یہ کہ اسے جیل سے رہا کرا لیا بلکہ اس کے خلاف مقدمہ ہی کو کالعدم قرار دلا دیا! کیا تاریخ میں ایسی مثال کہیں اور بھی مل سکتی ہے؟ مارچ ۱۹۷۱ء میں اسی مجیب اور اس کے ساتھیوں نے مشرقی پاکستان میں جو کچھ کیا خود حکومت کی طرف سے شائع کردہ قرطاس ابیض میں اسے غداری اور بغاوت قرار دیا گیا اور انکے اسی جرم کی بنا پر وہاں ملٹری ایکشن لیا گیا۔ لیکن اس ملٹری ایکشن نے کیا کیا۔ ان تمام غداروں اور باغیوں کو بھارت چلے جانے کے لئے راستے دے دیئے۔ اور ان کے سرغنہ (مجیب) کو حکومت اپنی حفاظت میں یہاں لے آئی۔ یہاں اسے ایک سال تک مہمانوں کی طرح رکھا۔ اس کے خلاف مقدمہ چلایا گیا لیکن اس کی کارروائی کو عمر خضر کی طرح دراز کرتے چلے گئے" اور اسی دوران میں (صدر نکسن کے بیان کے مطابق انہیں۔۔ اس کی ضمانت دی گئی کہ مجیب کو سزائے موت نہیں دی جائے گی۔

مجیب کے ساتھی بھارت میں بیٹھے ایسے حالات پیدا کر رہے تھے اور ادھر خود پاکستان کے اندر ایسی تحریک ابھاری جا رہی تھی کہ مقدمہ ختم ہونے سے پہلے ہی مجیب کو رہا کر دیا جائے۔ چنانچہ اس طرح حالات ایسے پیدا کر دیئے گئے کہ مجیب کو مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ اُدھر سے اس کے ساتھی بھی آ گئے اور اس طرح بغاوت کی وہ سازش کامیاب ہو گئی۔ اس سازش کو کامیاب کرانے اور پاکستان کو اس قدر ذلت آمیز شکست سے دوچار کرانے کا ذمہ دار چند جرنیلوں کو قرار دیا گیا لیکن انہیں باعزت (HONOURABLY) ریٹائر کر دیا گیا۔ پھر ان کے خلاف مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ اس شکست کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے صرف ایک کمیشن بٹھا دیا گیا۔ کمیشنوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں خود صدر بھٹو کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے ۳۰ دسمبر کو پنجاب یونیورسٹی ایڈیٹوریم میں زرمبادلہ کے سلسلہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> میں اس سلسلہ میں پہلی حکومتوں کی طرح کمیشن نہیں بٹھاؤں گا۔ جو کچھ ختم کرنا ہو اس پر ایک کمیشن بٹھا دو۔ (امروز۔ ۳۱ دسمبر)

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ پاکستان ایک عجیب ملک ہے کہ اس میں یہ اعلانات بھی مسلسل ہوتے رہتے ہیں کہ ملک میں غدار موجود ہیں۔ غداروں پر مقدمے بھی چلائے گئے (جنہیں انفصالِ مقدمہ سے پہلے ہی کالعدم قرار دیا گیا) لیکن جس میں آج تک کسی غدار کو جرم غداری کی سزا ملتے نہیں دیکھی گئی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ملک تاریخ کے نازک ترین موڑ پر کھڑا ہے اور اس میں غدارانہ سرگرمیاں پہلے سے بھی زیادہ زور پر ہیں۔ اگر آپ کا دیدۂ عبرت نگاہ ہے تو غور سے دیکھئے کہ یہاں آجکل کیا ہو رہا ہے اور اگر آپ کا گوش نصیحت نیوش ہے تو توجہ سے سنیئے کہ فضا میں کس کس قسم کی آوازیں پھیلائی جا رہی ہیں۔

(۱) کسی مملکت کے قیام کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں ایک قوم بستی ہو۔ غیر منقسم ہندوستان میں پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد یہی تھی کہ مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم نہیں بلکہ دو الگ الگ قومیں ہیں اس لئے ان کی مملکتیں بھی الگ الگ ہونی چاہئیں۔ اختلاف اس میں نہیں تھا کہ ایک الگ قوم کے لئے جداگانہ مملکت نہیں ہو سکتی۔ اختلاف صرف اس میں تھا کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک الگ قوم ہیں یا نہیں۔ اور جب ہم نے اپنے اس دعویٰ کو تسلیم کرا لیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں، تو ہمارا دوسرا مطالبہ جو پہلے مطالبہ کا منطقی نتیجہ تھا خود بخود تسلیم ہو گیا اور ہم نے ایک جداگانہ مملکت قائم کر لی۔ حاصلِ کلام یہ کہ ایک مملکت اس وقت تک ایک مملکت رہتی ہے جب تک اس میں ایک قوم بستی ہو۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس میں ایک سے زیادہ قومیں بستی ہیں تو پھر ہر قوم اپنے لئے جداگانہ مملکت کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ دیکھئے یہاں اس سلسلہ میں کیا کیا خیالات پرورش پا رہے اور پھیلائے جا رہے ہیں۔ پچھلے دنوں نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کا ایک کنونشن کراچی میں منعقد ہوا۔ اس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان میں سے ایک قرارداد میں کہا گیا کہ:

> پارٹی کا موقف یہ ہے کہ پاکستان متعدد قومیتوں پر مشتمل ایک ملک ہے جو مساوی سیاسی حقوق کی مستحق ہیں اور یہ مسئلہ حقِ خود ارادیت کے اصول پر عمل کر کے ہی حل ہو سکتا ہے۔
>
> (امروز۔ لاہور۔ ۸ فروری ۱۹۷۲ء)

ہم پوچھتے ہیں بہی خواہانِ پاکستان سے کہ ایک مملکت کے اندر متعدد قومیتوں کے تصور کی نشر و اشاعت مملکت کے خلاف بغاوت نہیں تو اور کیا ہے! لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہتا ہے اور جب اس قسم کی سازش اپنے منطقی نتیجہ (یعنی "بنگلہ دیش" کی طرح الگ مملکت کے قیام) تک پہنچتی ہے تو ہم یاد و ویلا مچانا شروع کر دیتے ہیں یا سر پکڑ کر

بیٹھ جاتے ہیں۔

نیپ کے اسی موقف کی بات آگے بڑھاتے ہوئے اس کے سربراہ خان عبدالولی خان نے پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

> ہم سمجھتے ہیں کہ جمہوریت ہی پاکستان کو بچا سکتی ہے۔ اور اب جو پاکستان باقی رہ گیا ہے اس کا بھی اتحاد کی یہی صورت ہے کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو مساویانہ بنیاد وں پر اقتدار میں شریک کیا جائے۔ (مشرق۔ لاہور۔ ۲۵ مئی)

مجیب نے بھی اپنے مطالبات کا آغاز اسی انداز سے کیا تھا اور ان کے ساتھ ایک ایسی عسکری تنظیم کی بنیاد بھی رکھ دی تھی جو وقت آنے پر باقاعدہ فوج کا کام دے۔ خان عبدالولی خان نے یہ سارا پروگرام اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا چنانچہ جب مجیب کی مکتی باہنی مشرقی پاکستان میں قتلِ عام کر رہی تھی تو خان ولی خان صاحب ڈھاکہ میں اپنی کار پر "بنگلہ دیش" کا پرچم لہراتے پھر رہے تھے انہوں نے مطالبات کا انداز بھی مجیب سے سیکھا اور ان کے حصول کے لئے عسکری تنظیم کا تصور بھی اسی سے مستعار لیا چنانچہ وہ اب یہاں وہی انداز اختیار کر رہے ہیں۔ مطالبات آپ نے ملاحظہ فرما لئے۔ اب انہیں منوانے کے طریق کو دیکھئے۔

امروز (لاہور) کی ۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ

> نیشنل عوامی پارٹی نے "پختون زلمے" کے نام سے پختون نوجوانوں کی تنظیم کو از سرِ نو منظم کرنا شروع کر دیا ہے۔ نیپ کے سربراہ خان عبدالولی خان تنظیم کے کمانڈر انچیف ہونگے۔ یہ تنظیم تحصیل اور ضلع کی سطح پر قائم کی جائے گی۔ خان عبدالولی خان نے زلمے کے تمام کمانڈروں سے اپنے گروپ کے ارکان کی فہرستیں طلب کر لی ہیں۔ تنظیم مکمل ہونے کے بعد اس کے کمانڈر انچیف خان عبدالولی خان سالاروں کے اجلاس بلائیں گے۔ زلمے کے ارکان سرخ ٹوپیاں پہنیں گے جبکہ کمانڈر سرخ رنگ کی جیکٹ اور اسی رنگ کی وردیوں میں ملبوس ہونگے۔

یہ جنوری کے آخری ہفتہ کی بات تھی۔ اور فروری کے پہلے ہفتہ میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی۔ کہ

> نیشنل عوامی پارٹی کے صدر اور پختون نوجوانوں کی تنظیم پختون زلمے کے سپریم کمانڈر خان عبدالولی خان نے آج یہاں سیاسی جماعتوں کی طرف سے نوجوانوں کو مسلح کرنے کے رجحان پر تشویش کا اظہار کیا۔ اور ساتھ ہی کہا کہ اگر خدانخواستہ عوام کے ایک حصے نے دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے تو ان کی تنظیم "پختون زلمے" کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکیگا۔ خان عبدالولی خان نے پشاور کینٹ میں پختون زلمے کے دفتر کی افتتاحی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ نیشنل عوامی پارٹی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے پر امن اور آئینی طریقوں پر یقین رکھتی ہے لیکن اگر ہم پر کوئی بات مسلط کی گئی تو یہ باقیماندہ پاکستان کے لئے بدترین دن ہوگا۔ (مساوات۔ ۴ فروری ۱۹۷۲ء)

یعنی جب تک مملکت ان کی باتیں مانتی چلی جائے گی یہ پرامن رہیں گے لیکن جونہی اس نے کوئی ایسا فیصلہ کیا جو ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوگا "وہ دن" باقیماندہ پاکستان کے لئے بدترین دن ہوگا۔ ازاں بعد ۱۶ فروری کے پاکستان ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔

خان عبدالولی خان نے (پشاور میں) کہا ہے کہ اگر موجودہ صورتِ حال کو بروقت بند نہ کیا گیا تو

اس کا نتیجہ وہ خون ریزی ہوگا جس کے بعد پیپلز پارٹی کے پاس بہت تھوڑا سا حصہ رہ جائیگا جس پر وہ حکومت کر سکے۔

یہ کچھ اس وقت ہو رہا ہے اور کیا جا رہا ہے جب ہنوز ملک میں مارشل لا رجاری ہے۔ مارشل لا کے اٹھ جانے کے بعد جس مطالبہ میں یہی خانصاحب پیش پیش ہیں) کیا ہوگا۔ اسے انہوں نے "بدترین دن" کی جامع اصطلاح سے واضح کر دیا ہے۔

اور یہ وہ پارٹی ہے کہ صدر بھٹو نے اقتدار سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اس پارٹی پر سے پابندی اٹھالی گئی تھی۔

(۲) یہ کچھ اس (سوختہ بخت) "باقیماندہ" پاکستان کی ایک سرحد پر ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس دوسری سرحد پر بلوچستان واقع ہے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے' اسے بھی ایک نظر دیکھتے جائیے۔ ہفتہ وار چٹان (لاہور) نے اپنی ۳۱ جنوری کی اشاعت میں (کراچی کے روزنامہ جسارت کے حوالہ سے) بلوچستان کے مشہور لیڈر نواب اکبر بگٹی کی ایک پریس کانفرنس کی روئداد کے جستہ جستہ اقتباسات شائع کئے ہیں۔ اس کانفرنس میں نواب صاحب نے فرمایا کہ:

> بنگلہ دیش تسلیم کئے جانے کی پنجاب کے سوا اور کسی صوبے کیطرف سے مخالفت نہیں کی جائے گی پنجاب سے بھی صرف اس لئے کہ وہاں بھارت کے خلاف نفرت پھیلائی گئی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھی اور اب بھی۔ جنگ میں صرف پنجاب متاثر ہوا ہے۔ فتح و شکست صرف پنجاب کی ہوئی ہے۔ حالیہ جنگ بھی صرف پنجاب کی جنگ تھی۔

اس مطلع کے بعد ٹیپ کا بند ملاحظہ فرمائیے۔

> کراچی ۱۹ جنوری (سٹاف رپورٹر) نواب اکبر بگٹی نے آج شام ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ گزشتہ دنوں لندن کے ایک اجلاس میں اندرا گاندھی زندہ باد، بنگلہ دیش زندہ باد، جگ جیون رام زندہ باد، دھی اتحادیت کا ہمدرد روس زندہ باد، اور پاکستان مردہ باد کے نعرے لگائے گئے جب نواب بگٹی سے ان نعروں پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ اس میں کیا حرج ہے۔ ایک حصہ کھو کر پاکستان مردہ ہو چکا ہے اور اگر ہم اندرا گاندھی کو زندہ باد نہ کہیں جس نے ۱۰ لاکھ پناہ گزینوں کو پناہ دی جبکہ مسلم فوج ان کی عزت و آبرو لوٹنے کے درپے تھی اور انہیں قتل کر رہی تھی تو پھر کسے زندہ باد کہیں انہوں نے بھارتی فوجوں کو غاصب افواج ماننے کے بجائے اتحادی فوج قرار دیا۔

یہ رہیں اس "باقیماندہ" پاکستان کی دونوں سرحدیں۔ ان کے درمیان سندھ آتا ہے۔ جی۔ ایم سید صاحب وہاں کے تخریبی عناصر کے سرخیل ہیں اور ایک عرصہ سے اسلام اور پاکستان کی مخالفت اور مخاصمت میں سرگرم عمل۔ پچھلے دنوں انکے متبعین نے ان کی سالگرہ منائی۔ اس تقریب کی کچھ جھلکیاں ہفتہ وار المنبر (لائلپور) نے اپنی ۴ فروری کی اشاعت میں دکھائی ہیں۔ آپ بھی انہیں ایک نظر دیکھ لیجئے۔ اس تقریب میں:

> نوجوان ایک دوسرے سے "السلام علیکم" کے بجائے "جے سندھ" کہہ کر بغلگیر ہوتے رہے۔
>
> جب جی ایم سید سٹیج پر آئے تو صدر جلسہ قاضی فیض محمد نے "بنگلہ دیش زندہ باد" "سندھو دیش زندہ باد" اور "سر ڈلیسوں سندھ نہ ڈلیسوں" کے نعرے لگائے۔

اس تقریب میں جب سالگرہ کیک کاٹا جانے لگا تو سٹیج سے اعلان کیا گیا "اب سرزمین سندھ کو خون سے سرخ کرنیوالے ہاتھوں کو کاٹا جا رہا ہے اور جی ایم سید کے ہاتھوں ان ظالموں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا ہے جنہوں نے گزشتہ ۲۴ سال سے سرزمین سندھ کو لوٹا ہے"

سٹیج سے "مارشل لاء پر لعنت" کے نعرے لگائے گئے۔

جی ایم سید نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

آزادی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں، بنگال کے تیس لاکھ مسلمانوں نے شہید ہونے کے بعد کہیں بنگال کو آزاد کرایا ہے۔

پاکستان کے موجودہ انتشار و سافرانفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے اور وہ ہیں :-

۱۔ دو قومی نظریہ ۔ ۲۔ مذہبی نظام حکومت کا تخیل ۔ ۳۔ فسطائی نظریہ سیاست ۔ ۴۔ ہمسایہ ملکوں سے دشمنی۔

اس نظریہ پر اعتماد کیوجہ سے ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ بالخصوص یہ کہ بنگال، سندھ، بلوچستان اور پختون کی ہزار ہا سال پرانی قوموں کے وجود سے انکار کرنا پڑا۔

مذہبی نظام حکومت اور بھارت دشمنی کے نعرے لگا کر عوام کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹائی گئی۔

انہوں نے مطالبہ کیا کہ :- (۱) ۲۴ سالہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے جداگانہ نظریہ کو خیرباد کہا جائے۔ اور پاکستان میں ۵ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ ۲۔ بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قوموں کی ریاستوں کو مکمل خودمختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتہ سے ایک فیڈریشن بنائی جائے جس میں مرکز کو دفاع، کرنسی اور خارجہ پالیسی کے تین شعبے دیئے جائیں اور باقی تمام امور علاقائی ریاستوں کے سپرد ہوں۔ ۳۔ صدر بھٹو سیکولر نظام حکومت کی پالیسی مرتب کریں۔ ۴۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کیا جائے۔ ۵۔ بھارت سے سمجھوتہ کیا جائے۔ ۶۔ پاکستان کی سیاست سے "ملاؤں" اور "پیروں" کے اثرات کو زائل کیا جائے۔

اس تقریب میں نیشنل عوامی پارٹی سندھ کے صدر کامریڈ غلام محمد لغاری نے کہا کہ

"اب تک ہمیں اسلام، نظریہ پاکستان اور استحکام پاکستان کے نام سے لوٹا گیا ہے۔ "بنگلہ دیش" آزاد کرنے والے ہر طرح سے مستحق مبارکباد ہیں اور ہم ان کے حضور زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور ان کو "سلامی" پیش کرتے ہیں" انہوں نے کہا۔

"ہمیں پاکستان نہیں چاہیئے۔ ہمیں "آزاد سندھ" چاہیئے جس میں سندھیوں کی حکمرانی ہو"

ایک طالب علم لیڈر اقبال تمین نے اسی اجلاس میں کہا۔

"سندھودیش" قائم ہو کر رہے گا اور جو لوگ اس راہ میں مداخلت کریں گے ان کے خون سے دریائے سندھ سرخ ہو جائے گا اور سندھ کے گلی کوچے اور بازار لاشوں سے پٹ جائیں گے"

المنبر نے اپنی اسی اشاعت میں ایک اور راز کا بھی انکشاف کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

پیپلز پارٹی کے مقامی راہنما احمد نواز اعوان نے انکشاف کیا ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی سندھ کے آرگنائزنگ سیکرٹری جام ساقی نے کچھ عرصہ قبل بھارت اور دیگر غیر ممالک کی حکومتوں کو محضرنامہ بھیجا ہے جس میں کہا گیا ہے

کہ پاکستانی فوج سندھ کے لوگوں پر مظالم کر رہی ہے۔ ہماری مدد کو پہنچئے۔ مسٹر احمد نواز اعوان نے آج نوابشاہ میں متوآباد پیپلز پارٹی کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ اس محضرنامہ پر بیس ہزار افراد کے دستخط ہیں۔

ہم پوچھتے ہیں اربابِ حکومت سے کہ پاکستان جیسی مملکت میں جو ایک نظریہ کی بنیادوں پر قائم ہوئی ہے کیا اس قسم کی سرگرمیاں مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف نہیں؟ اور اگر یہ ایسی ہیں تو پھر حکومت ان کے انسداد اور استیصال کے لئے کیا کر رہی ہے؟

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں ہمیں صرف حکومت کی توجہ کو اس طرف مبذول کرا کر اطمینان سے نہیں بیٹھ جانا چاہیئے اس لئے کہ ان سرگرمیوں کے نتیجہ میں جو قیامت آئے گی وہ اربابِ حکومت تک ہی محدود نہیں رہے گی' اس کی لپیٹ میں ساری قوم آئے گی۔ مشرقی پاکستان کا سانحہ ہو چکا ہمارے سامنے ہے۔ وہاں اس سیلاب پر کون بند باندھ سکا۔ یہی کچھ (خدا نہ کردہ) یہاں بھی ہوگا بلکہ اس سے بھی شدید تر۔ مشرقی پاکستان کے مظلوم ہم مغربی پاکستان والوں کو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ خدا کے لئے ہمیں اپنی حفاظت میں لے لو۔ اگر (خاکم بدہن) یہاں وہی صورت پیدا ہو گئی تو ہم کسے پکاریں گے؟ ہم نے یہیں رہنا ہے۔ ہماری آنے والی نسلوں نے یہیں رہنا ہے۔ ہماری معصوم بہنوں بیٹیوں نے یہیں پروان چڑھنا ہے اور ان کی عصمت و ناموس نے اسی خطہ زمین کے دامن میں پناہ لینی ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ تنہا حکومت کا نہیں۔ اس سے ہم سب متعلق ہیں۔ ہماری آنے والی نسلیں متعلق ہیں۔ ہمارا وہ سب کچھ متعلق ہے جس کی حفاظت ہمیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور اگر اس سے بھی آگے بڑھیں تو ہمارے جیسے وہ "اگلے وقتوں کے لوگ" جو اس خطۂ زمین کو حکومتِ خداوندی کے قیام کا ذریعہ سمجھتے ہیں، لہٰذا ان کے لئے اس کی حفاظت ان کے ایمان کا تقاضا ہے۔ اس سوال کا تعلق ان کے دین اور ایمان سے ہے۔ بنابریں' ہم قوم کے تمام ہوشمند طبقہ سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مسئلہ کی نزاکت کا احساس کریں۔ ہماری یہ اپیل ان اربابِ قلبِ سلیم سے ہے جن کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہیں ۔۔۔ کہ سیاسی پارٹیاں اپنے مفاد سے بلند ہو کر کچھ سوچ نہیں سکتیں۔ اور جو کچھ ہونا چاہیئے' ان کی سیاسی مصلحتیں اس کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتی ہیں۔ ہماری ان سے اپیل یہ ہے کہ خدا کے لئے یہیں سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ ان سازشوں کے نتیجہ میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے' جو تباہی ہم پر آنے والی ہے' اس کی روک تھام کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر اس قسم کی تباہی آئی' تو جس طرح (کچھ وقت کے لئے ہی سہی) مجیب کو بھارت کے دامن میں پناہ مل گئی ہے' مغربی پاکستان کے ان غداروں کو بھی اپنے اپنے آقاؤں کے آستانوں پر پناہ مل جائے گی' اور پس جائیں گے ہم وہ سب جنہوں نے اس سرزمین کے علاوہ کسی آستانے کو اپنی پناہ گاہ نہیں بنایا۔ لہٰذا یہ مسئلہ ہمارے ہی سوچنے کا ہے ۔۔۔ کیا پاکستان کا کوئی رجلِ رشید قوم کی بیٹیوں کے ناموس کا درد اپنے دل میں لے کر اور ہر طرح کے سیاسی مفادات سے بلند ہو کر اس مسئلے کے حل کے لئے اپنی آواز بلند کرے گا؟ خدا کے قانونِ مکافات نے ابھی ہمیں اتنی مہلت دیدی ہے کہ ہم اس کے متعلق کچھ سوچ کر کوئی حل تلاش کر لیں۔ اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر اس سیلاب سے ہمیں کوئی نہیں بچا سکیگا۔

(۲)

ہم نے اوپر کہا ہے کہ عصرِ حاضر میں دشمن کی تیکنیک یہ ہوتی ہے کہ جس ملک کو اس نے اپنا ہدف بنانا ہو' وہ پہلے اس میں خلفشار پیدا کرا دیتا ہے۔ اس وقت اس خلفشار کی لہریں ابھرنی شروع ہو گئی ہیں۔ یہ جو جگہ بہ جگہ گھیراؤ۔ جلاؤ۔ پتھراؤ کے واقعات رونما ہو رہے ہیں' یہ اسی خلفشار کے مظاہر ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ۱۹۶۹ء میں جب "انقلاب زندہ باد" کے مغالطہ آفریں نعروں کے ساتھ اس "فساد فی الارض" کی طرح ڈالی گئی تھی۔ تو ہم نے ان داعیانِ انقلاب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ

الٰہ دین کے اس جن کو بوتل سے باہر نہ نکالتے جب یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الٰہ دین کے بس میں بھی نہیں رہے گا۔ ہم نے کہا تھا کہ آپ جو قوم کو قانون شکنی کی تعلیم دے رہے ہیں، اس وقت آپ خوش ہیں کہ اس سیلاب کا رُخ آپ کے حریف کی طرف ہے۔ لیکن کل کو جب آپ کے حریف اسی حربہ کو خود آپ کے خلاف استعمال کریں گے تو اس وقت آپ کو احساس ہو گا کہ آپ نے اس جن کو بوتل سے کیوں نکال دیا۔ اس وقت یہ حضرات' اپنے حریف کو شکست دینے کی خوشی میں اس قدر مدہوش تھے کہ انہوں نے اس پند مدیرانہ کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ اب جو پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی ہے تو ان کے حریفوں نے وہی حربہ ان کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس سے ان کے پیشِ نظر دوہرا مقصد ہے۔ ایک مسٹر بھٹو کی قائم کردہ حکومت کو ناکام بنانا اور دوسرے ملک میں انتشار پیدا کر کے بیرونی دشمن کے لئے زمین ہموار کرنا۔ چنانچہ چند ہی دنوں کے اندر دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ اس تیزی اور شدت سے بھڑکی ہے کہ ملک کا کوئی گوشہ اس سے محفوظ نہیں رہا۔ مزدوروں نے گھیراؤ جلاؤ سے کارخانوں پر قبضہ کر لیا۔ مزارعوں نے زمینوں پر تصرف جما لیا۔ کرایہ داروں نے دکانوں کے مالک بن بیٹھے۔ طلباء نے پرنسپل کو نکال کر خود کالج پر قبضہ کر لیا۔ یہ سلسلہ اس حد تک دراز ہوا کہ پیپلز پارٹی کے مرکزی سیکرٹریٹ کے دفتر پر خود اسی پارٹی کے ایک گروپ نے غاصبانہ قبضہ جما لیا۔ حتیٰ کہ

> حیدرآباد میں پولیس کے ملازمین نے ہڑتال کر دی۔ لاٹھیوں اور رائفلوں سے مسلح پولیس کے تین سو ملازمین نے شہر میں زبردست احتجاجی جلوس نکالا۔ مظاہرین نے ایک محلے کا ریکارڈ نذرِ آتش کر دیا۔ افسروں کا گھیراؤ کر لیا۔ ان سے ہاتھا پائی کی اور اسلحہ خانہ پر قبضہ کر لیا۔ جلوس کے شرکاء نے ٹریفک کا نظام درہم برہم کر دیا۔ مسلح مشتعل مظاہرین کے اشتعال انگیز نعروں سے شہر میں سخت خوف و ہراس اور دہشت پھیل گئی ...... پولیس ملازمین کی طرف سے ہڑتال سے پیدا شدہ صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے مقامی انتظامیہ نے فوج کا ایک دستہ اور سائڈس رینجرز کی دو پلاٹون طلب کر لی ہیں۔ (نوائے وقت۔ ۲۳ مئی ۱۰)

جہاں تک ہماری معلومات ہماری راہ نمائی کرتی ہیں' یہ پہلا موقعہ ہے کہ پولیس نے اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کسی ملک کی انتہائی بدقسمتی اور تباہی کی علامت ہے کہ قانون اور ضابطے کے محافظ اور امنِ عامہ کے نگہبان خود قانون شکنی اور فساد انگیزی پر اتر آئیں۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما!

جب صورتِ حال یہاں تک پہنچ گئی تو صدر بھٹو نے اس کی نزاکت کا احساس کیا اور سخت ترین الفاظ میں وارننگ دی کہ اب حد ہو گئی ہے۔ اب اس "غنڈہ گردی۔ فساد انگیزی۔ تباہ کاری" کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اسے شدت کے ساتھ کچلا جائے گا۔ (دی پیوٹائمز۔ راولپنڈی۔ ۲ مئی ۱۱)

لیکن تماشہ یہ کہ اُدھر صدرِ مملکت اس قسم کی وارننگ دے رہے تھے' اور اِدھر' انہی کے وزیرِ تعلیم (مسٹر خورشید حسن میر) گورنمنٹ کالج مینگ سٹوڈنٹس یونین کی رسمِ حلف برداری کی تقریب پر

طلباء پر زور دے رہے تھے کہ وہ سرمایہ داروں اور زرِ مبادلہ واپس نہ کرنے والوں کا گھیراؤ کریں۔ (امروز۔ ۲ مئی ۱۰)

"وذیرے چنیں شہریارے چنیں" کی پرانی مثل کے جدید معانی کس طرح ابھر کر سامنے آ رہے ہیں! سچ ہے جس پارٹی کے اراکین کی تربیت کئے بغیر انہیں اقتدار کی ذمہ داریاں تفویض کر دی جائیں' اس میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔

(۰)

ملک میں انتشار پھیلانے والوں کا عذر یہ ہے کہ ہم مارشل لاء اٹھانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جہاں تک طلوعِ اسلام کا تعلق ہے جو نظامِ حکومت بھی قرآنی بنیادوں پر استوار نہ ہو وہ مارشل لاء کا "جلال پادشاہی" ہو یا "جمہوری تماشہ" دونوں غیر اسلامی ہیں۔ لیکن اس سے نیچے اتر کر اگر دیکھا جائے تو مارشل لاء اٹھانے کا مطالبہ کرنے والوں کا موقف بڑا معنی خیز ہے۔ اس مارشل میں ان لوگوں کو جس قدر آزادیاں حاصل ہیں، عام جمہوری نظام میں بھی اتنی آزادیاں کم دیکھائی دیتی ہیں ۔۔۔ اس مارشل لاء میں تو کیفیت یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں) ملک میں ایسی سرگرمیاں عام ہو رہی ہیں جو بغاوت اور غداری کے مرادف ہیں اور ایسا کرنے والوں کے خلاف کوئی "نرم سا نرم" ایکشن بھی نہیں لیا گیا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ مارشل لاء اٹھانے کے بعد مسٹر بھٹو کو اسمبلی میں بلا منت غیرے، اکثریت حاصل ہوگی اور جو کچھ وہ اب کرنا چاہتے ہیں وہی کچھ اس وقت "قانون سازی" کی رسم پوری کرکے کرلیں گے۔ بنابریں، ان کی موجودہ اور اس وقت کی پوزیشن میں فرق کیا ہوگا؟ اصل بات یہ ہے کہ مارشل لاء اٹھانے کے مطالبہ کے پس پشت جو مقصد ہے اسے یہ لوگ اعلانیہ بیان نہیں کرنا چاہتے، اور عوام کے جذبات سے کھیل کر اپنے اس مقصد کو حاصل کرلینا چاہتے ہیں۔ اس مطالبے کے پیچھے ملک کے بڑے بڑے صنعتکاروں، سرمایہ داروں، زمینداروں کے مفاد کارفرما ہیں۔ جو تبدیلیاں مارشل لاء کے ماتحت ہوں گی ان کے خلاف کسی عدالت میں چارہ جوئی نہیں ہوسکے گی۔ اور اگر وہ تبدیلیاں اسمبلی کے پاس کردہ قانون کے تحت ہوں گی، تو اول تو یہ پارٹیاں اسمبلی ہی میں ان مسائل کو اتنا طول دیدیں گی کہ ان کے فیصلہ ہونے تک یہ سرمایہ دار طبقہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے کچھ کا کچھ کرلیگا۔ اور اگر یہ قوانین نافذ بھی ہوگئے تو ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی شروع کردی جائے گی ۔۔۔ اور قانونی چارہ جوئی کے سلسلہ میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا کسے علم نہیں۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے، مارشل لاء اٹھانے کے مطالبہ کے لئے یہ حضرات جلے پاؤں کی بلی بن رہے ہیں۔ سادہ لوح عوام اتنی گہرائی میں تو جا نہیں سکتے۔ ان کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے اتنا سا نعرہ ہی کافی ہے کہ ہم عوام کا جمہوری نظام چاہتے ہیں۔ اس قسم کی اشتعال انگیز سرگرمیوں سے، ان حضرات کے پیشِ نظر سہ مقاصد کے حصول کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔ یعنی (۱) مسٹر بھٹو کی حکومت کو ناکام بنانا۔ (۲) سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مفاد کا تحفظ، اور (۳) ملک میں انتشار پھیلا کر دشمن کے مذموم عزائم کی تکمیل کا سامان فراہم کرنا۔

جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس کے باوجود (بلکہ ہم کہیں گے کہ اسی کی بنا پر) مسٹر بھٹو سے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ مارشل لاء اٹھانے میں قطعاً تاخیر نہ کریں اور اس کے لئے ایک متعین تاریخ کا اعلان کردیں۔ وہ ۲۵ مارچ کو چند ایک اصلاحات کا اعلان کرنے والے ہیں کیوں نہ اسی کو مارشل لاء اٹھانے کی تاریخ قرار دے دیا جائے۔ اور جو اہم اصلاحات وہ مارشل لاء کی رُو سے نافذ کرنا چاہتے ہیں انہیں اس دوران میں نافذ کردیں۔ سب سے اہم اصلاح، اراضیات کے متعلق یعنی (LAND REFORMS -) ہے۔ اسے جلد از جلد نافذ کردیں۔ اسی سے بہت سے شورش پسند چودھریوں کی چودھراہٹیں ختم ہو جائیں گی اور لیڈریاں ماند پڑ جائیں گی۔ مرکزی وزیرِ خوراک (محترم معراج خالد صاحب) نے کہا ہے کہ وہ زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں اہم نکات کی وضاحت چند دنوں تک کردیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ پرچہ کی بروقت اشاعت کی مجبوری کی وجہ سے ہم اس وضاحت کا انتظار نہیں کرسکتے۔ اس لئے اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنا قبل از وقت ہوگا۔ ہم بنیادی طور پر صرف اتنا گزارش کریں گے کہ سابقہ زرعی اصلاحات کے تجربہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس امر کی خاص احتیاط برتی جائے کہ ان میں ایسے "چور دروازے" نہ رہنے پائیں جن کی وجہ سے اصلاحات کے باوجود، ماہر شاطر لاکھوں ایکڑ دبا

کا مالک بنایا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے تو زمین کے ایک انچ رقبہ پر بھی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس منتہیٰ تک بتدریج پہنچا جا سکتا ہے' اور وہ بھی قرآن کریم کے کُلّی معاشی نظام کی رُو سے۔ بسر دست ذاتی ملکیت کی تحدید (حد بندی) ہی ممکن ہو گی۔ لیکن یہ تحدید اس انداز سے کی جائے کہ اس سے نکلنے کا کوئی چور دروازہ نہ بچنے پائے۔

اور اس مسئلہ میں خود مسٹر بھٹو کا بھی بہت بڑا اسٹیک ہے۔ وہ خود بہت بڑے زمیندار ہیں اور ظاہر ہے کہ اصلاحات کا اثر سب سے پہلے خود ان کی ذات پر پڑے گا۔ انہیں چاہیئے کہ اس مسئلہ میں خود پہل کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کر دیا تو نہ صرف یہ کہ وہ پاکستان کے بہت بڑے محسن قرار پا جائیں گے بلکہ قوم کی آنکھوں کا تارا بھی بن جائیں گے۔ یہ' قانونِ خداوندی کی اطاعت میں پہل کرنے (یعنی اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ کہنے اور ایسا کر کے دکھانے) کا نتیجہ ہے جو اسلام کے صدرِ اول کے سربراہانِ مملکت کے نام آج تک صلوٰۃ و سلام سے لئے جاتے ہیں۔

اور اگر وہ (خدا نکردہ) اس امتحان (اور اسی قسم کے دوسرے امتحانوں) میں فیل ہو گئے' تو' نہ صرف یہ کہ اس سے وہ خود ختم ہو جائیں گے' بلکہ اس کے ساتھ'۔۔۔ ہماری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں ۔۔۔ وہ سوچ لیں کہ اس وقت ان کے سر پر کس قدر عظیم ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں ان امتحانوں میں پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۰)

چند الفاظ مجوزہ آئینِ پاکستان کے سلسلہ میں بھی ضروری ہیں۔ مرکزی وزیرِ قانون نے کہا ہے کہ آئین کا مسودہ زیرِ تدوین ہے۔ اور اسے اسمبلی میں پیش کیا جائے گا۔ آئین کے سلسلہ میں ہم اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ اس کے متعلق سردست نہ کچھ مزید کہنے کی ضرورت ہے نہ گنجائش۔ جب آئین کا مسودہ سامنے آئے گا تو ہم اپنے خیالات کا اظہار کر دیں گے۔ اور وہ اسمبلی میں پیش ہو گا تو ہم اپنی تجاویز اور معروضات کو ارکانِ اسمبلی تک بھی پہنچا دیں گے۔ اس وقت اس سلسلہ میں صرف دو ایک اہم نکات کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے۔ سب سے پہلے وہی معصومانہ "شوشہ" جو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے چھوڑا جایا کرتا ہے اور جس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ آئین مرتب ہی نہ ہو سکے اور انہیں حکومت کے خلاف شورش برپا کرنے کا موقع ملتا رہے۔ قارئین کو یاد ہے کہ مودودی صاحب نے' بیس بائیس برس کی ہٹ دھرمی کے بعد' بالآخر اس کا اعتراف اور اعلان کر دیا تھا کہ "کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جس پر مسلمانوں کے مختلف فرقے متفق ہو سکیں" لہٰذا کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو نہیں سکتا جو مختلف فرقوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف و اعلان بھی کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ حکومت سے کہہ رہے ہیں کہ مجوزہ آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ اور جملہ قوانین کتاب و سنت کے مطابق وضع کئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی تجویز ہے جو خود ان کے اپنے الفاظ کے مطابق ناممکن العمل ہے۔ انہوں نے اس ناممکن العمل تجویز کو دہرایا ہی اس لئے ہے کہ ملک میں فتنہ برپا کرنے کے مواقع موجود رہیں۔ حکومت اس قسم کا ضابطہ بنا نہ سکے اور یہ شور مچاتے رہیں کہ دیکھئے حکومت اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتی۔ اسے برطرف کیا جائے۔

مودودی صاحب نے تو ایسا کرنا ہی تھا کہ وہ پاکستان میں آئے اور بیٹھے ہی اسی مقصد کے لئے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ محترم وزیرِ قانون نے بھی یہ اعلان کرنا شروع کر دیا ہے کہ ملک کے قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب ہوں گے۔ ہم انہیں یاد

کرنے کے لئے تیار نہیں کہ میاں محمود علی قصوری صاحب جیسے ماہرِ قانون کی نگاہوں سے یہ حقیقت اوجھل ہو کہ کتاب و سنت کی بنیاد پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کرلیں۔ اور اگر وہ از خود اس نتیجہ پر نہ پہنچ پائے ہوں تو مودودی صاحب کا یہ اعتراف اور اعلان تو بہرحال ان کے علم میں ہوگا جس میں انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر، محترم میاں صاحب کی ذات سے ہزار حسنِ ظن کے باوجود انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انہوں نے بھی عافیت اسی میں سمجھی ہے کہ بھڑوں کے اس چھتے کو چھیڑا نہ جائے۔ جو کچھ مذہبی پیشوائیت کہتی ہے (وہ ممکن العمل ہو یا نہ) اسے تسلیم کرلیا جائے۔ ہمارا وقت گزر جائے گا۔ اس کے بعد اگر شورش برپا ہوگی تو اسے وہ جانیں جو اس وقت برسرِ اقتدار ہوں گے۔ یہی مسلک گزشتہ پچیس سال سے مختلف اربابِ حکومت اختیار کرتے رہے ہیں۔ یہی مسلک (ایسا نظر آتا ہے کہ) اب اختیار کیا جا رہا ہے، حالانکہ اس بھڑوں کے چھتے کی نیش زنی سے بچنے کا طریقہ بڑا آسان ہے اور وہ یہ کہ

> حکومت، پاکستان میں بسنے والے مختلف فرقوں سے کہے کہ وہ اپنے ہاں کا ایک ایک منتخب عالم نامزد کریں۔ ان علماء کی مجلس سے کہا جائے کہ وہ (مثلاً) چھ مہینے یا سال بھر کی مدت میں ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر دیں جس پر ان سب کا اتفاق ہو۔ خود مودودی صاحب کو اس مجلس کا قیم مقرر کر دیا جائے۔

نہ یہ ضابطہ مرتب ہوگا، نہ انہیں شورش برپا کرنے کا موقعہ ملیگا۔

یاد رکھیئے۔ اسلامی مملکت کے آئین و قوانین کے مرتب کرنے کا اس کے سوا کوئی طریق نہیں کہ قرآن کریم کے احکام و اصولوں کی غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے، حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین خود مرتب کئے جائیں اور ان کی عملی تشریح کے لئے عدالتِ عالیہ (سپریم کورٹ) کو ذمہ دار قرار دیا جائے۔ قرآن کریم کے حدود ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین، حالات کے تغیر کے ساتھ، حسبِ ضرورت، بدلتے رہیں گے۔ جو مملکت بھی اسلامی آئین و قوانین مرتب کرنے کے مسئلہ کے متعلق (SERIOUS) ہوگی اسے یہی طریق کار اختیار کرنا ہوگا۔ لیکن اگر کوئی اس کے لئے (SERIOUS) ہی نہ ہو تو اس کے لئے مصلحت کی راہ یہی ہے کہ وہ اسلام کے نام کی مالا جپتا رہے اور کرے وہی جو اس کے جی میں آئے۔ اس سے مملکت غیر اسلامی رہتی ہے تو رہا کرے اور اسلام کے متعلق یہ خیال عام ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں تو ممکن العمل تھا لیکن اب اس کی حیثیت ایک چلے ہوئے کارتوس سے زیادہ کچھ نہیں، تو ہوا کرے۔ ان کی بلا سے۔ جو اسلام کے متعلق (SERIOUS) ہی نہیں اسے اس کا کیا درد ہے کہ اسلام دنیا میں کس قدر بدنام ہو رہا ہے۔

آئین کے سلسلہ میں دوسری اہم بات، مرکز اور صوبوں کے اختیارات کی ہے۔ مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا وہ اسی مسئلہ کا لازمی اور فطری نتیجہ تھا۔ ہم اس حقیقت کا بار بار اعادہ کر چکے ہیں کہ ہماری تباہی کا بنیادی سبب صوبوں کا وجود ہے انہی کی وجہ سے ہم نہ ایک قوم بن سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری مملکت ایک مستحکم مملکت۔ صوبائی خود مختاری (PROVINCIAL AUTONOMY) کا تصور ہی علیحدگی کا پیش خیمہ ہے۔ اس کا پہلا قدم، مرکز کا کمزور کرنا ہوتا ہے اور اگلا قدم، مرکز سے علیحدگی، یعنی ایک جداگانہ آزاد مملکت کی تشکیل۔ مجیب یہ کچھ کر چکا ہے اور اس کے ہمنوا یہاں یہ کچھ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ عبدالغفار خان صاحب

کے صاحبزادہ عبدالولی خان صاحب نے ابھی اگلے دنوں لاہور میں کہا ہے کہ

"میری پارٹی کے پیش نظر ایک ایسے فیڈرل نظام کا تصور ہے جس میں صوبے یہ فیصلہ کریں کہ مرکز کو کون کون سے اختیارات تفویض کئے جائیں۔" (نیو ٹائمز۔ ۱۲/۲/۷۲)

ظاہر ہے کہ جس مملکت میں صوبے یہ فیصلہ کریں کہ مرکز کو کون کون سے اختیارات تفویض کئے جائیں، اس میں مملکت صوبوں کی ہوگی یا مرکز کی؟ یہ ہے نقشہ ان لوگوں کے ذہن میں آئندہ مملکت پاکستان کا!

ہم نے اوپر خان عبدالغفار خان کا نام یونہی برائے وزن بیت نہیں لیا۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ گھرانا شروع ہی سے پاکستان کا سخت ترین مخالف چلا آ رہا ہے۔ خان صاحب نے تحریک پاکستان کے دوران اس مطالبہ کی اسی طرح مخالفت کی جس طرح ان کے صاحبزادہ اس وقت اس مملکت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جب ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کا فیصلہ ہو گیا، اور کانگرس کے ہندو لیڈروں (گاندھی۔ جواہر لعل نہرو۔ پٹیل تک) نے اسے تسلیم کر لیا، تو یہ خان عبدالغفار خان تھے جو اس وقت بھی اس کے شدید ترین مخالف تھے۔ اس وقت ان کے اضطراب کی کیا کیفیت تھی اس کا اندازہ اس روئداد سے لگ سکتا ہے جسے (مولانا) آزاد نے اپنی کتاب 'انڈیا ونز فریڈم' میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں عبدالغفار خان نے ہندو لیڈروں سے کہا تھا کہ

اگر کانگرس نے تشکیل پاکستان کی اسکیم کو منظور کر کے ہمیں بھیڑیوں کے حوالے کر دیا تو میں اسے پٹھانوں کے خلاف غداری قرار دوں گا۔ (ص ۱۹۳)

اس کے بعد انہوں نے تجویز پیش کی کہ اس مسئلہ پر سرحد میں ریفرینڈم کرایا جائے۔ جب لارڈ مونٹ بیٹن نے اس تجویز کو منظور کر لیا تو انہوں نے کہا کہ ریفرینڈم میں صرف یہی نہ پوچھا جائے کہ پٹھان ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ، بلکہ یہ بھی پوچھا جائے کہ کیا وہ اپنی آزاد مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لارڈ مونٹ بیٹن نے اس آخری شق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بہرحال ریفرینڈم ہوا اور سرحد کی اکثریت نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیئے۔ آپ غور کیجئے کہ جن لوگوں کے پاکستان کے بارے میں یہ خیالات اور جذبات ہوں، ان سے کسی بہی خواہی کی توقع کی جا سکتی ہے! اور اس قسم کی خبریں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں کہ خان عبدالغفار خان کی کابل میں، بھارتی قونصل سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں! (مساوات۔ ۱۵/۲/۷۲)

یہ ہیں اس مملکت کے لیڈروں کے کوائف! ہم تو محو حیرت ہیں کہ اس ملک میں ہو کیا رہا ہے اور ہونے کیا والا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ متعجب اور متاسف کہ ملک میں کوئی جماعت کوئی فرد ایسا نہیں جو ان مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر کر کے اس مملکت اور اس کے ساتھ خود اپنے آپ کو تباہی سے بچانے کی تدبیر سوچے۔ اگر کوئی قوم کسی غیر متوقع اچانک حادثہ سے تباہ ہو جائے تو اس کی تعزیت میں ایک ٹھنڈی سانس بھرنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا لیکن جس قوم کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا ہو اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو کہ اس کا ہر قدم تباہی کی طرف اٹھ رہا ہے اور اس کے باوجود اس سے بچنے کے لئے کچھ نہ کرے اس کی تباہی پر (قرآن کریم کے الفاظ میں) "نہ آسمان رویا کرتا ہے نہ زمین"۔

اگر اس مملکت کو بچانا مقصود ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی طریق نہیں کہ یہاں وحدانی انداز حکومت (UNITARY FORM OF GOVT.) قائم کی جائے اور اگر موجودہ حکومت اپنے اندر اس کی سکت نہیں پاتی، تو علیٰ سبیل تنزل ایسا طرز اختیار کیا جائے جس میں زیادہ سے زیادہ اختیارات مرکز کے پاس ہوں اور کم از کم صوبوں کی تحویل میں! اس کے لئے

مرکز میں دو ایوانات مقرر کر لئے جائیں۔

تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ آئین میں ایسی شق رکھی جائے جس سے نالائق، غلط کار، تخریب کوش، سربراہ مملکت کو پُرامن طریق سے الگ کیا جاسکے تاکہ آئندہ فوجی حکام کے لئے سول کے معاملات میں دخل اندازی کی گنجائش نہ رہے۔ جمہوری طرز کا بنیادی نقص ہے کہ اس میں سربراہ مملکت قوم کے انتخاب سے برسرکار آتا ہے۔ لیکن اس کے بعد قوم اسے (یا کسی اور کو) پُرامن طریق سے الگ نہیں کرسکتی۔ اس طرز حکومت کا یہی وہ بنیادی نقص ہے جس کی وجہ سے فوج کو بار بار دخیل کار ہونا پڑتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب ملک کا پولیٹیکل اقتدار اور عسکری اقتدار ایک ہی ہاتھ میں ہو تو اس کا نتیجہ تعمیری نہیں ہوسکتا۔ اس سے جو کچھ گزشتہ کئی سالوں میں ہوا اسے چھوڑیئے، مشرقی پاکستان میں جس طریق سے لڑائی لڑی گئی اور ہمیں ایسی ذلت آمیز شکست ہوئی وہ بھی اسی کا نتیجہ تھی۔ پولیٹیکل مصلحتوں کا تقاضا یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا رقبہ بھی دشمنوں کے قبضہ میں نہیں جانا چاہیئے تاکہ وہ وہاں "بنگلہ دیش" کی حکومت قائم نہ کرلے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے فوج کو، ملک کی اس قدر طویل سرحد پر پھیلا دینا پڑا۔ اگر یہ جنگ، خالصتہً عسکری نقطہ نگاہ سے لڑی جاتی" تو مقصد پیش نظر آخرالامر دشمن کو شکست دینا ہوتا۔ اس دوران میں کہیں دشمن آگے بڑھتا، کہیں ہم اسے پیچھے ہٹاتے اور جنگ کا فیصلہ فوج کی آخری فتح و شکست سے ہوتا۔ جنگ کے یہ دونوں تقاضے باہدگر متضاد تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مملکت کا سیاسی اور عسکری اقتدار ایک ہی ہاتھ میں تھا (اور وہ بھی بدقسمتی سے) ایک رعشہ زدہ ہاتھ میں)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سیاسی اور عسکری دونوں محاذوں پر پٹ گئے۔

بہرحال یہ ایک ضمنی گوشہ تھا۔ یہ اصول ہی غلط ہے کہ (سول اور ملٹری کے موجودہ نظام میں) سیاسی اور عسکری اقتدار ایک ہی ہاتھ میں ہو۔ لہٰذا آئندہ آئین میں ایسا انداز رکھنا چاہیئے جس سے فوج کے لئے سول معاملات میں دخل اندازی کی گنجائش نہ رہے اور نہ ہی سول اقتدار فوج کے اندرونی نظم و نسق میں دخل دے سکے۔ (یاد رکھیئے۔ ہم نے "اندرونی نظم و نسق" کہا ہے۔ ورنہ فوج، مملکت کی بالادستی سے آزاد نہیں ہوسکتی)۔

فوج کی بات سامنے آگئی تو ضروری محسوس ہوا کہ جو کچھ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا تھا اسے دہرا دیا جائے۔ یعنی یہ کہ قوم کے دل میں فوج کا احترام رہنا از بس ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ (سابق جنرل) یحییٰ خان اور اس کے چند اور رفقاء نے قوم سے غداری کی ہے لیکن یہ فوج کے چند افراد کا ذاتی کردار ہے۔ اس سے ساری کی ساری فوج کو مطعون قرار دینا نہ صرف فوج کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ فوج کو قوم کے اس اعتماد سے محروم کر دینے کا بھی ذریعہ ہے جس کی تائید و تقویت سے وہ میدان جنگ میں ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ کس قدر مقام تاسف ہے کہ جن افراد نے ایسی غداری کی ہے اُن کے خلاف تو مقدمہ تک نہ چلایا جائے (بلکہ انہیں باعزت ریٹائر کیا جائے) اور اُن کے جرم کی پاداش میں ساری فوج کو عزت و احترام سے محروم کر دیا جائے۔ اسی ضمن میں حکومت نے ایک اور غلطی بھی کی ہے۔ ان غدار جرنیلوں کے عقب میں بعض ایسے افسروں کو بھی علیحدہ کیا گیا ہے جو کسی طرح بھی موجودہ قضیئے میں ملوث نہیں تھے اور انہیں غالباً از روئے تخفیف ریٹائر کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اُن کے سلسلے میں اس امر کی وضاحت نہیں کی گئی اس لئے عوام کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ فوج کے افسران بالا کی کھیپ کی کھیپ ہی نالائق یا غدار تھی۔ دوسری طرف فوج کے دل میں جو یہ خیال تھا کہ جو شخص قابل اور نیک کردار ہو اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوسکتا۔ ان کے اس اعتماد کو بھی دھچکا لگا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس دوہرے نقصان کا ازالہ کیا جائے۔

حالیہ المناک حادثہ کے علاوہ یہ خیال بھی عام کیا جا رہا ہے کہ ملک میں گزشتہ ۱۳ برس سے جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں ان کی ذمہ دار بھی فوج ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ ان خرابیوں میں فوج کا کس قدر حصہ ہے۔ (سابق صدر) ایوب خان نے ایک فوجی سربراہ کی حیثیت سے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تو قوم نے اطمینان کا سانس لیا اور جشنِ مسرت منایا۔ انہوں نے چند دنوں کے بعد فوج کو بارکوں میں بھیج دیا اور اگرچہ ملک میں مارشل لا باقی رکھا لیکن ملک کے نظم و نسق میں فوج کا کوئی حصہ نہیں تھا نظم و نسق سارا سول کے ہاتھ میں تھا۔ پھر مارشل لا اٹھنے کے بعد ملک میں کاملۃً سول حکومت تھی اور انتخابات کے ذریعے قوم کے نمائندے برسرِ اقتدار آ گئے تھے۔ آپ کو ان انتخابات پر اعتراض ہو سکتا ہے اور نظم و نسق کی خرابیاں بھی گنائی جا سکتی ہیں لیکن یہ کہنا یکسر حقیقت کے خلاف ہوگا کہ ان کی ذمہ دار فوج تھی۔ (سابق جنرل) یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالا تو اس کے ایک سال بعد سیاسی پارٹیوں پر سے پابندیاں اٹھا لیں اور انہیں اپنی اپنی سرگرمیوں کے لئے کھلی چھٹی دیدی۔ انتخابات بھی ہوئے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ انہی سیاسی پارٹیوں کی باہمی آویزش کا نتیجہ تھا اگرچہ اس میں یحییٰ خان بھی ڈوریاں کھینچتا رہا۔ پھر ضمنی انتخابات ہوئے تو ان میں بھی ان سیاسی پارٹیوں نے پورا پورا حصہ لیا۔ فوج اس وقت میدان میں اتری جب ان سیاسی آویزشوں کی وجہ سے حالات بے قابو ہو گئے۔

آپ غور کیجئے کہ گزشتہ ۱۳ سالہ نظم و نسق کی خرابیوں میں فوج کا کس قدر ہاتھ ہے۔ یہ ساری خرابیاں (یحییٰ خان اینڈ کو کی غداری سے قطع نظر) خود سیاسی پارٹیوں کی پیدا کردہ ہیں لیکن وہ عوام کی توجہ کو دوسری طرف موڑنے کے لئے اسکی ذمہ داری فوج کے سر پر ڈال رہی ہیں۔ یہ درست ہے کہ یحییٰ خان کے دورِ حکومت میں بعض فوجی افسروں سے بھی بدعنوانیاں سرزد ہوئیں۔ لیکن یہ اسی قسم کی بدعنوانیاں تھیں جو سول حکومت کے عمال کی طرف سے گزشتہ ۲۵ برس سے سرزد ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ ان کی وجہ سے بھی آپ پوری کی پوری فوج کو بدنام نہیں کر سکتے۔ ہماری فوج پہلے بھی قابلِ فخر تھی اور اب بھی قابلِ فخر ہے ضرورت ہے کہ عوام کے دل میں فوج کے متعلق جو غلط خیالات پیدا کر دیئے گئے ہیں انہیں دور کیا جائے۔ آج ہم رونا روتے ہیں کہ پاکستان میں افراد بستے ہیں قوم نہیں — یہ قوم ہماری سول آبادی میں بے شک موجود نہیں لیکن فوج اب بھی ایک "قوم" ہے۔ آپ جتنی خصوصیات ایک قوم میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ سب فوج میں موجود ہیں — اجتماعی زندگی، ڈسپلن، اطاعت، قانون کا احترام، یک جہتی، رنگ، نسل، زبان، صوبجاتی امتیاز، ذات، برادری کے اختلاف وغیرہ کے تمام وجوہِ تفریق کو بالائے طاق رکھ کر ایک اجتماعی وحدت جس کی زندگی کا مقصد ایک ہے، نصب العین حیات ایک ہے، اور وہ نصب العین ہے اپنی جان دیکر قوم کی حفاظت کرنا فرمایئے۔ اس سے اچھی قوم بھی آپ کو کہیں مل سکتی ہے۔ اس قوم کو نگۂ حقارت سے نہ دیکھئے۔ اسکی تقویت کا سامان بہم پہنچایئے۔ اس کا وجود ہمارے لئے باعثِ صد فخر و نازش ہے اور وجہِ ہزار طمانیت۔

اس سلسلے میں ہم سے ایک اور بنیادی غلطی بھی سرزد ہوتی چلی آ رہی ہے اور وہ یہ کہ ہم نے ملک اور فوج دونوں کے سامنے مقصد صرف ملک کی حفاظت رکھا ہے۔ اس سے توانائیاں ہمت اور عزائم سکڑ جاتے ہیں ہمیں پہلے دن سے اپنے سامنے مقصد یہ رکھنا چاہیئے تھا کہ تقسیم ہند کے زمانے میں جو علاقے پاکستان کا حصہ بننے چاہئیں تھے لیکن جنہیں دھاندلی سے ہندوستان کو دے دیا گیا تھا ہمیں وہ علاقے بھی واپس لینے ہیں اور کشمیر، جونا گڑھ وغیرہ (جن علاقوں پر ہندو نے غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے) انہیں بھی ہندو کے ہاتھ سے چھڑانا ہے۔ ہمیں اب بھی ملک اور فوج کے سامنے یہی مقصد رکھنا چاہیئے بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے۔ اور وہ یہ کہ ہندو نے اس ۲۵ سال کے عرصے میں ہم پر اور ہندوستان کے مسلمانوں پر جس قدر زیادتیاں

کی ہیں ہم نے اُن کا بھی انتقام لینا ہے۔ ان مقاصد کو فوج کے سامنے رکھیئے اور ان خیالات کو ملک میں عام کیجئے اور ہندو کی دراز دستیوں کے خلاف جذبۂ انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے رہیئے۔ اسے قوم کا متحدہ مقصد قرار دیجئے اور ملک میں جو آواز اس کے خلاف، اور ہندو کے حق میں اٹھے، اس کا گلا گھونٹ دیجئے کہ یہ مملکتِ پاکستان کے خلاف غداری ہوگی۔

حالیہ حوادث میں ہم جس تباہی سے دوچار ہوئے ہیں اس نے قرآن کریم کے متعلقہ دعاوی کی صداقت کی شہادت پیش کردی ہے۔ قرآن کریم نے کہا تھا کہ جو قوم اپنی نسبت اسلام کی طرف کرتی ہے اس کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ اسلام اور صرف اسلام کی نسبت سے اپنے اندر اخوت پیدا کرے، باہمی محبت اور مودت سے رہے۔ اپنے اندر کسی قسم کا اختلاف نہ پیدا ہونے دے۔ سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقہ بندیوں میں تقسیم نہ ہو۔ دوسری طرف وہ غیر مسلموں کو اپنی قوم کا جزو قرار نہ دے۔ اُن سے انسانیت کا سلوک تو کرے لیکن انہیں اپنا رازدار نہ بنائے۔ اُس نے کھلے الفاظ میں کہا تھا کہ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ اغیار تمہیں جھپٹ کر لے جائیں گے۔ ہم نے ایسا نہ کیا اور نتیجہ وہی برآمد ہوا جس کی نشاندہی قرآن نے کی تھی۔ کہیئے کہ یہ چیز قرآنی نظریۂ زندگی کی صداقت کی دلیل ہے یا اس کے (معاذ اللہ) جھوٹا ہونے کی شہادت۔ نصب العین یا نظریہ کے اشتراک کی بنا پر قومیت کی تشکیل ایک بنیادی صداقت ہے۔ اس لئے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ المیہ دو قومی نظریہ کی ناکامی ہے۔ وہ یا تو جہالت اور خود فریبی کا شکار ہیں اور یا دانستہ فریب دہی کے جرم کے مرتکب۔ اگر پاکستان میں دو قومی نظریہ پر عمل کیا جاتا تو یہ تباہی کبھی نہ آتی۔ اور دنیا کی کوئی قوم ہمیں شکست نہ دے سکتی جس طرح ایک نظریہ پر عمل کرنے کے خوشگوار نتائج اس کی صداقت کی دلیل بنتے ہیں۔ اسی طرح اس نظریہ کی خلاف ورزی کے تباہ کن عواقب بھی اس کی حقانیت کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ موجودہ حوادث نے دو قومی نظریہ اور اس حقیقت پر کہ — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی — ہمارے ایمان کو اور مستحکم کردیا ہے۔ (اور یہ امر ان تمام حضرات کے لئے جو طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر سے متمسک چلے آرہے ہیں وجۂ ہزار سکون اور باعثِ صد ہزار طمانیت ہونا چاہیئے۔)

~~~~~~~~ (۷) ~~~~~~~~

آخر میں ہم چند ایک گزارشات محترم صدر بھٹو کی خدمت میں پیش کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں، اس استدعا کے ساتھ کہ وہ (اور ان کی پارٹی کے اربابِ فکر و نظر) ان پر سکونِ قلب سے غور کریں۔

(۱) ملک جن تباہیوں کے گرداب میں پھنس رہا ہے، ان میں مسٹر بھٹو اور ان کی حکومت کا وجود اس کے مستقبل کے لئے امید کی آخری کرن، اور حفاظت کا آخری سہارا ہے۔ اس حقیقتِ نفس الامری کے پیشِ نظر انہیں سوچنا چاہیئے کہ ان کے سر پر کس قدر عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر (خدا نکردہ) وہ اپنے اس امتحان میں پورے نہ اترے تو اس سے یہ نہیں ہوگا کہ ان کی حکومت کی جگہ کوئی دوسری حکومت آجائے گی۔ اس کے بعد وہ مملکت ہی باقی نہیں رہے گی جس میں اپنی حکومتیں قائم ہو سکیں۔ یہ لکھتے وقت ہمارا جگر تو شق ہوتا ہے لیکن حقیقت کو زبان پر لانا ہی پڑتا ہے خواہ وہ کیسی ہی کرب انگیز اور جگر پاش کیوں نہ ہو۔ بقول اقبال ؎

اس اندیشہ سے ضبطِ آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مغ بچے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری

(۲) آپ نے اپنی حکومت کو اپنی پارٹی کے ارکان تک محدود رکھا ہے۔ پارٹی کو برقرار رکھنے کے لئے اس قسم کے اقدامات
~~~~~~~~

بے شک ضروری ہوتے ہیں لیکن اس وقت آپ کے سامنے مقصد اس سے بلند اور وسیع ہونا چاہیئے۔ یعنی صرف پارٹی کا استحکام نہیں بلکہ مملکت کا استحکام آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ اقربا نوازی (NEPOTISM)، اور احباب پروری (FAVOURITISM) کیوں مطعون اور مردود ہیں؟ اس لئے کہ ان سے ذمہ دار افراد کا انتخاب ان کی صلاحیت کی بنا پر (ON MERIT) نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ "اپنوں" میں سے ہوتے ہیں۔ بعینہٖ یہی شکل اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب آپ ذمہ دار ارکان کا انتخاب صرف اس معیار کے مطابق کریں کہ ان کا تعلق آپ کی پارٹی سے ہے۔ اس مقصد کے لئے آپ کے سامنے پوری کی پوری قوم ہونی چاہیئے اور انتخاب کا معیار اہلیت اور صلاحیت (MERIT) ان افراد کے لئے، آپ کے مقصد و مسلک سے وفاشعاری (LOYALTY) بے شک ضروری شرط ہونی چاہیئے، لیکن ایسے افراد ملک کے جس گوشے میں بھی ہوں انہیں اپنے گرد جمع کر لیجئے اور اس طرح اپنا ایک "فکری ہیولا" (BRAIN TRUST) قائم کیجئے جو پیش آمدہ معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کے بعد آپ کو صحیح مشورہ دے سکے۔ جو حکومت جلد بازی میں فیصلے کرتی اور پھر ان فیصلوں کو اسی طرح تیزی سے بدلتی رہتی ہے قوم کے دل میں اس کا وقار نہیں رہتا۔ آپ نے اس وقت تک جن ارکان کا انتخاب کیا ہے ان میں بیشتر ایسے ہیں جنہیں نہ کاروبار حکومت کا تجربہ ہے اور نہ ہی اس کے چلانے کی صلاحیت۔ اس انتخاب کو عارضی حیثیت ہی دیجئے اور جب آپ نے مستقل طور پر حکومت کا ڈھانچہ مرتب کرنا ہو تو پھر ایسے افراد کو منتخب کیجئے جو پختہ کار اور با صلاحیت ہونے کے علاوہ قابل اعتماد سیرت و کردار کے حامل ہوں، خواہ وہ آپ کی پارٹی کے اندر ہوں، یا اس سے باہر۔ اس طرح آپ کی حکومت مستحکم ہو سکے گی اور اس کے استحکام سے مملکت پاکستان کو بھی پائیداری نصیب ہوگی۔

(۳) اس وقت آپ کی پارٹی نے (اور اس پر مشتمل حکومت) نے مختلف گوشوں کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ اس کی بین وجہ ان میں سے اکثر کی ناپختہ کاری اور عدم تربیت ہے۔ مخبرین کے خلاف ایکشن لینے سے اگر وہ، یا ان کے متعلقین، ناراض ہوتے ہیں تو ہوا کریں لیکن یہ تو کوئی خوبی نہیں کہ بلاوجہ ہر ایک کو اپنا دشمن بنا لیا جائے۔ فوج کے خلاف بلاوجہ جذبات نفرت و حقارت کے اظہار سے فوج کی ناراضگی، سول حکام کی بلا سبب تحقیر و تذلیل سے ان کی برافروختگی۔ اپنی پارٹی سے باہر اپنائے قوم میں سے ہر ایک کو بددیانت اور بدکردار سمجھ لینے سے، شرفائے ملت کی ناراضگی۔ عوام سے ناممکن الایفاء وعدے کر کے ان کے پورا نہ ہونے پر عوام کی رنجیدگی — ہمارے محترم! اس طرح حکومت نہیں چلا کرتی۔ حکومت چلانے کے لئے علامہ اقبالؒ کی اس نصیحت کو سامنے رکھیئے کہ۔

بملازمان سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دلنوازے

اور اس کے ساتھ ہی قرآن کریم کی بیان کردہ اس ابدی حقیقت کو بھی حرز جان بنائیے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ۔ خرابیاں دور کرنے کا طریق یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اچھے (تعمیری کام) کئے جائیں۔ آپ کی پارٹی کے بیشتر ارکان کے پیش نظر تعمیری کاموں سے عزت حاصل کرنا نہیں۔ ان کے سامنے یا تو ڈانٹ ڈپٹ سے رعب جمانا ہے اور یا اوچھے حربوں سے سستی شہرت حاصل کرنا۔ آپ ان کی تربیت کا انتظام کیجئے کہ جہانبانی کے لئے بڑی سخت تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے گورنروں میں سے ایک سے ذرا سی کوتاہی ہوگئی تو انہوں نے اسے بلا کر کمبل کا کرتہ پہنایا۔ عصا ہاتھ میں

دیا اور کہا کہ چھ ماہ کے لئے صحرا میں بکریاں چراؤ۔ اس سے تم رعایا کی پرورش کا طریقہ سیکھ سکو گے۔ (رائی کہتے ہی گڈ ھا بنتے کو ہیں)

(۴) آپ کی پارٹی کے بعض ارکان (جن میں متوسلین حکومت بھی شامل ہیں) اپنے حدود ذمہ داری سے آگے بڑھ کر دور ازکار بیانات دیتے رہتے ہیں، اور ان میں اکثر ایسی باتیں آپ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جن کے متعلق بدیہی طور پر نظر آتا ہے کہ انہیں آپ نے ایسا کہنے کی اجازت نہیں دی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس سے ان کا مقصد ——— بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم۔ ہوتا ہے۔ لیکن اس سے آپ کی ذات کو جس قدر نقصان پہنچتا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ان باتوں پر خاص طور پر کڑی نگاہ رکھئے اور انہیں اپنی حدود کے اندر رہنے کی تاکید کیجئے۔

(۵) مملکت کے لئے ایک شدید خطرہ مذہبی پیشوائیت کا وجود ہے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنے تخریبی مقاصد کے لئے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اور جس "دستِ غیب" پر ان کی سرگرمیوں کا انحصار ہے اس نے ایسی "سلیمانی ٹوپی" اوڑھ رکھی ہے کہ وہ سب دیکھتا ہے لیکن اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا جب ان سے کہا جائے کہ آپ یہ کچھ کیوں کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں ہو سکتی حالانکہ اسلام نے کہا یہ تھا کہ سیاست کو دین کے تابع رہنا چاہیئے اور یہ دین کو اپنی سیاست کے تابع رکھتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا۔

دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

دوسرا گروہ ان کا ہے جو ہوتے تو جاہل ہیں لیکن کہلاتے عالم ہیں۔ ان کا مسئلہ معاشی ہے۔ یہ ساری عمر ان "علوم" کی تحصیل میں ضائع کر دیتے ہیں جو دین اور دنیا دونوں کے لئے بیکار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ مذہب کو اپنا پیشہ قرار دیں۔ اگر آپ اعداد و شمار جمع کریں تو آپ پر یہ تحیر انگیز حقیقت منکشف ہو گی کہ مملکت سے دفاع پر اتنا صرف نہیں ہوتا جتنا یہ بیکاروں کی فوج کھا جاتی ہے۔ اور اس فوج میں ہر سال ہزاروں کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ سوچئے کہ جس درخت پر اس قدر گھنی اکاس بیل چھا رہی ہو اس کے سرسبز و شاداب ہونے کی کوئی صورت ممکن ہے؟ پھر اتنا ہی نہیں کہ یہ ملک کی پیداوار میں کسی مادی یا فکری تخلیق کے اضافہ کے بغیر، قوم کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے اتنا کچھ ہڑپ کر جاتے ہیں، یہ مملکت کی سیاست کے پھڈے میں بھی اپنی ٹانگ اڑاتے ہیں۔ حالانکہ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کی کیفیت علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ہوتی ہے۔

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اس لئے اسلام نے ان دونوں کو ختم کر دیا۔ لیکن اس کے بعد جب امت کی گاڑی دوسری پٹڑی پر چل نکلی تو ملوکیت اور سرمایہ داری نے سر ابھارا اور اس کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت کی نمود بھی ہو گئی۔

مذہبی پیشوائیت کی پرابلم بڑی پیچیدہ ہے۔ اس لئے اس کا حل تو زمانہ امن و سکون ہی میں ہو سکے گا۔ اس وقت اتنا ہی کافی ہے کہ آپ ان کے "فی سبیل اللہ فساد" پر کڑی نگاہ رکھیں اور انہیں ان کے مقام سے آگے نہ بڑھنے دیں۔ جماعتِ اسلامی نے ابھی سے آپ کی حکومت کو "لادینی اشتراکیت" کہنا شروع کر دیا ہے۔ اور مفتی محمود صاحب فرماتے ہیں کہ "اگر پاکستان استحکام اور امن چاہتا ہے تو اسے بھارت کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لینا چاہیئے" (مساوات ۲۰ فروری ۱۹۷۲ء)

—اور عوام جو یہ بزرگوار اتنا سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں کہ اس وقت بین الاقوامی سیاست کا رُخ کس طرف کو ہے، اور ہندوستان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کے عملی عواقب کیا ہوں گے؟

(۶) سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ تعلیم کا ہے۔ ہماری مملکت میں جو خرابیاں پیدا ہوتی رہی ہیں اور آخر الامر جس تباہی سے ہم دوچار ہوئے ہیں اس کا بنیادی سبب ہمارا غلط نظامِ تعلیم ہے۔ آپ کی حکومت کی طرف سے، تعلیمی اصلاحات کے متعلق بھی اعلانات ہو رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہم اندازہ لگا سکے ہیں، اس کے پیشِ نظر محض نظم و نسق کی میکانکی تبدیلیاں ہیں۔ اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اس کے لئے پورے کے پورے نظام اور نصاب کو اس طرح بدلنا ہوگا کہ ہماری نئی نسل کے قلب و دماغ میں نظریۂ پاکستان پیوست ہو جائے اور آگے چل کر وہ نہ صرف اس نظریہ کے پُرجوش حامی اور مبلغ بن سکیں بلکہ مادہ پرستی کے لادینی سیلاب کا بھی مقابلہ کر سکیں۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ قرآنِ کریم کی مستقل اقدار و اصول کو ان کی تعلیم کی بنیاد قرار دیا جائے اور دنیاوی اور مذہبی تعلیم کی موجودہ ثنویت کو ختم کیا جائے۔ ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ چیز موجودہ اربابِ نظم و نسق کے بس کی بات نہیں۔ (ضمناً، حکومتِ پنجاب کے ایک مشیر نے بسم اللہ ہی اس تجویز سے کی ہے کہ پنجاب میں ایک مذہبی یونیورسٹی قائم کی جائے اور اس کے لئے جم خانہ کلب کی عمارت منتقل کر دی جائے۔ اس قسم کے حضرات کے ذہن میں اس تعلیم کا تصور کیسے آ سکتا ہے جو پاکستان جیسی مملکت کا سنگِ بنیاد بن سکے اور جو اس اسلام کا احیا کر سکے جس نے صدرِ اول کا سا انسانیت ساز معاشرہ تخلیق کیا تھا۔ اس کے لئے آپ کو گہری سوچ بچار اور صحیح مشوروں کی ضرورت ہوگی۔

(۷) اس وقت آپ کے سامنے جو پیچ در پیچ مسائل ہیں ان کا ہمیں پورا پورا احساس ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مجیب کے متعلق آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں گے۔ اس نے وہاں کے غیر بنگالیوں پر جو مظالم شروع کر رکھے ہیں وہ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ مغربی پاکستان ان کی چیخ و پکار کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ اور انہیں ان اذیتوں سے نجات دلانے کے لئے اس کی یہ شرط فوراً قبول کر لے گا کہ ان ستم رسیدگان کو ادھر منتقل کر دیا جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان بیچاروں کی مصیبتوں کے احساس سے ہماری نیندیں حرام ہو رہی ہیں، لیکن پاکستان کے کلی مفاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ مجیب کی اس تجویز کے ما لہٗ و ما علیہ پر اچھی طرح غور و خوض کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچا جائے۔ آبادیوں کے تبادلہ کی تجویز کوئی نئی بات نہیں۔ اکثر ملکوں میں ایسا ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے لئے اولین شرط یہ ہوتی ہے کہ جو زائد آبادی کسی مملکت کی طرف منتقل ہو اس کے لئے حسبِ رسدی علاقہ بھی اس مملکت کی طرف منتقل کیا جائے۔ مشرقی پاکستان کا کوئی علاقہ تو مغربی پاکستان کی طرف منتقل کیا نہیں جا سکتا کیونکہ اس علاقہ کا مغربی پاکستان سے ملحق ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا انہیں چاہیئے کہ مجیب سے کہیں کہ وہ بھارت سے یہ طے کرے کہ وہ متعینہ مقدار میں اپنا ایک علاقہ ہماری طرف منتقل کر دے تاکہ ہم اس زائد آبادی کو بسا سکیں۔

دوسرا مسئلہ جنگی قیدیوں کا ہے۔ اور یہ بھی ہمارا بڑا ہی نازک اور دُکھتا ہوا پہلو ہے جس سے بھارت ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ اس کے لئے اس قسم کی شرائط پیش کر رہا ہے کہ "بنگلہ دیش" کو تسلیم کیا جائے۔ کشمیر کا تنازعہ ختم سمجھا جائے۔ اُس سے ترکِ جنگ کا معاہدہ کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی شرط بھی ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس مسئلہ کو بین الاقوامی قوانین و ضوابط کے مطابق حل کرانا چاہیئے جن کی رُو سے جنگی قیدیوں کا بلا شرط تبادلہ ہوتا ہے۔

(۸) حکومت کی پبلسٹی کی مشینری اطمینان بخش نہیں۔ ضرورت ہوتی ہے کہ حکومت جو فیصلے کرے، پبلک کو ان کے وجوہ اور مصالح سے آگاہ کیا جائے۔ اس سے تخریبی عناصر کے لئے، فتنے پھیلانے کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن اس وقت حکومت کے ذرائع ابلاغ کی طرف سے ایسا نہیں ہو رہا۔ ایک تو مارشل لاء کے متعلق بنیادی تصور ہی کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی فیصلہ دلیل و برہان یا معقولیت پر مبنی نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوتا ہے "دھاندلی" سے ہوتا ہے۔ اس پر حکومت کے اقدامات کے مصالح کی طرف سے خاموشی۔ نتیجہ یہ کہ عوام میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیل جاتی ہیں۔ اس کا سدباب ضروری ہے۔ جن اقدامات کے اسباب و علل کو بوجوہ صیغۂ راز میں رکھنا مقصود ہو، ان کے متعلق تو فقط اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان کا اعلان و اظہار مملکت کے مفاد میں نہیں۔ لیکن دیگر اقدامات کے متعلق ضروری ہے کہ عوام کو ان کے وجوہ اور مصالح سے اچھی طرح آگاہ کیا جائے۔

(۹) جن ارکان کو آپ نے حکومت کے مختلف شعبوں میں بطور مشیر تعینات کیا ہے ان کا بیشتر وقت جلسوں، ہنگاموں، تقریبوں، پارٹی کے پراپیگنڈہ کے پروگراموں (وغیرہ) کی نذر ہو جاتا ہے اور دفتری امور کی طرف توجہ دینے کے لئے ان کے پاس بہت کم وقت رہتا ہے۔ یہ طریق کار غلط ہے۔ ایک تو دفتری کا معیار ایسے ہی بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ پھر ان مشیر حضرات کو اس کام کا تجربہ بھی نہیں۔ ان کے لئے اشد ضروری ہے کہ یہ سارا وقت دفتری امور کے مطالعہ اور معائنہ میں صرف کریں اور فائلوں کی گہرائی تک پہنچ کر اپنا فیصلہ ثبت کریں۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو عمال دفاتر انہیں ایسا چکر دیں گے کہ ان کے لئے اس گرداب سے نکلنا دشوار ہو جائے گا۔ دفتر کا بابو بڑی بلا ہوتا ہے۔ وہ بڑے بڑے تجربہ کاروں کو ایسی تگنیاں دیتا ہے کہ یاد کریں۔ یہ مشیر نوآموز اس کے حریف کس طرح ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ دفاتری امور کو سارا وقت دیں۔ اور محنت بھی پوری پوری کریں۔ اور اس کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ متعلقہ عملہ کی تغیر و تبدیل نہ ہونے پائے۔ پارٹی کے امور دوسرے ارکان کے سپرد کئے جائیں اور مشیروں کو ان کی طرف سے بالکل فارغ رکھا جائے۔

(۱۰) اور آخری مشورہ یہ ہے کہ آپ بڑی بڑی تبدیلیوں کو سردست ملتوی کر دیں اور اپنی ساری توجہ ملک کے تحفظ پر مرکوز رکھیں۔ ملک محفوظ اور مستحکم رہا تو تبدیلیاں بھی ہو جائیں گی۔ اور اگر یہی گزند زدہ ہو گیا تو تبدیلیوں کو کون پوچھے گا۔ اس کے متعلق آپ عوام کو نہایت اطمینان اور سکون سے سمجھا دیں۔

سردست اتنا ہی کافی ہے۔ ان امور پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ اپنے رفقائے کار پر عقابی نگاہ رکھیئے اور جادۂ عدل و انصاف سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہٹئے۔ اللہ کی نصرت آپ کے شامل حال رہے گی۔

(۰)

اور اب، کچھ گزارشات۔ ملک کے عوام کی خدمت میں۔

(۱) یہ غنیمت تھا کہ یحییٰ کی حکومت کی ناکامی کے بعد مسٹر بھٹو اور ان کی اکثریت کی منتخب پارٹی ملک میں موجود تھی جس نے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس ملک میں جو تباہی مچتی اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت مقدم اور بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ حکومت بہر حال مستحکم رہے۔ لہٰذا آپ اس کی خامیوں کی طرف نہ جایئے۔ ملک کے اس بنیادی تقاضا کو سامنے رکھئے اور کوئی قدم ایسا نہ اٹھائیے جس سے حکومت کو ضعف پہنچے۔

(۲) پیپلز پارٹی نے جن تبدیلیوں کا وعدہ کیا تھا، اگر یہ امن اور سکون کے عام حالات میں برسر اقتدار آتی تو ان سے ان کا فوری مطالبہ کیا جا سکتا تھا لیکن بہ حالات موجودہ نہ یہ ان کے لئے ممکن ہیں، نہ ہی ہمیں ان سے اس قسم کے مطالبات

کرنے چاہئیں۔ مطالبہ ایک ہی کرنا چاہیئے اور وہ یہ کہ وہ اس ملک کو دشمنوں کی اندرونی اور بیرونی سازشوں سے بچا لیں۔

(۳) جو لوگ اس وقت ملک میں گھیراؤ۔ جلاؤ۔ پتھراؤ سے خلفشار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ پاکستان کے دشمن ہیں۔ ان کی اپنی قوت کچھ نہیں۔ قوت آپ (عوام) ہیں۔ اگر آپ ان کا ساتھ نہ دیں تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے آپ کسی ہنگامہ آرائی اور فساد انگیزی کا ساتھ نہ دیں خواہ اس کے لئے کیسی ہی وقیع دلیلیں کیوں نہ دی جائیں۔

(۴) افواجِ پاکستان پر کسی قسم کی تنقید اور تنقیص نہ کریں۔ ان پر اعتماد رکھنے سے ہماری حفاظت ہو سکے گی جہاں تک ممکن ہو ان کی تائید کیجئے اور ان کی قربانیوں کے لئے ان کے شکر گذار ہو جئے۔

(۵) اور سب سے آخر یہ کہ ملک اس وقت بڑے ہی نازک دور سے گزر رہا ہے۔ اس وقت اگر آپ کو کچھ تکالیف بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں تو انہیں ہمت اور حوصلہ سے برداشت کر لیجئے۔ اسی میں ملک کی بقا کا راز ہے اور ملک کی بقا سے ہماری بقا وابستہ ہے۔

مایوس اور بزدل نہ ہو جئے۔ اگر آپ نے حکومت سے تعاون کیا تو ہمیں یقین کامل ہے کہ وہ پاکستان کے تحفظ کا سامان بہم پہنچا دیں گے۔ واللہ المستعان۔ علیہ توکلت والیہ منیب۔

پس تحریر: یہ پرچہ مکمل ہو گیا تھا کہ اخبارات میں مسٹر جی۔ ایم۔ سید کا ایک خط شائع ہوا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ انکی سالگرہ کی تقریب کے سلسلہ میں جو کچھ ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ مسخ شدہ ہے۔ اس وقت نہ ہمارے پاس گنجائش ہے نہ وقت کہ ہم ان کے بیان پر کوئی تبصرہ کر سکیں۔ اس وقت صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کا بیشتر حصہ "عذر گناہ بدتر از گناہ" سے زیادہ کچھ نہیں۔ (المرقوم ۲۲-۱)

طلوعِ اسلام کالج

کے لئے زمین کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے گزٹ نوٹیفیکیشن شائع ہو گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی کو اس پر کوئی اعتراض ہو تو وہ ایک ماہ کے اندر اندر (یعنی ۱۴ مارچ تک) اپنے اعتراضات پیش کر دیں۔ ان اعتراضات کی مدافعت کے بعد زمین کا قبضہ منتقل ہو جائے گا۔ ہمیں امید کامل ہے کہ یہ قبضہ اب غیر معمولی تاخیر کے بغیر ہمیں مل جائے گا۔ ہم یہ نوید جانفزا حتمی طور پر اپریل کے پرچہ میں باعثِ فردوس گوش کر سکیں گے۔ واللہ المستعان۔ اور اگلے پرچہ ہی میں طلوع اسلام کنونشن کے متعلق حتمی طور پر اعلان کر سکیں گے۔ متوسلین فکرِ قرآنی تھوڑا سا اور انتظار فرما لیں۔

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوع اسلام بابت نومبر ۷۱ء حسب ذیل عطیات بشکریہ وصول ہوئے فہرست "ب"

۱۔ محترمہ ثریا افضل صاحبہ ۔ راولپنڈی ۔ ۲۵۰/-
۲۔ محترم نثار اللہ خان صاحب۔ اسلام آباد ۔ ۳۷/-
۳۔ بزم طلوع اسلام ۔ مردان ۔ ۴۰۰/-
۴۔ محترم ظہور الدین بھٹی صاحب ۔ لاہور ۔ ۵/-
۵۔ " خالد نذیر صاحب ۔ لاہور ۔ ۵/-
۶۔ " محمد حسین شاہ صاحب۔ بوساطت دینہ جہلم ۔ ۲۰/-
۷۔ صوبیدار منور خان صاحب برنالہ تحصیل مری ۔ ۵۰/-
۸۔ محترمہ نعمت بیگم صاحبہ بلکسر کہار۔ تحصیل چکوال ۔ ۱۰/-
۹۔ " نفیس بیگم صاحبہ ۔ کراچی ۔ ۲۵/-
۱۰۔ محترم ظہور الدین صاحب ۔ لاہور ۔ ۵/-
۱۱۔ " بشیر احمد صاحب ۔ ملکوال ۔ ۵/-
۱۲۔ " ظہور الدین صاحب ۔ لاہور ۔ ۵/-
۱۳۔ سید نثار احمد صاحب ۔ کراچی ۔ ۳۰/-
۱۴۔ وارنٹ آفیسر محمد زمان صاحب بلکسر کہار تحصیل چکوال ۔ ۱۵۰/-
۱۵۔ ساہیوال کے ایک مخیر دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے ۔ ۳۰۰/-
۱۶۔ محترم عبد الرحمٰن صاحب ۔ لاہور ۔ ۴/-
۱۷۔ " بشیر احمد صاحب۔ ملکوال ۔ ۵/-
۱۸۔ " نشانی خالد صاحب ۔ ابو ظہبی (ٹروشل اسٹیٹ) ۔ ۱۵۰/-
۱۹۔ نوابشاہ کے ایک مخیر دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے ۔ ۱۰۰/-
۲۰۔ محترم ظہور الدین بھٹی صاحب ۔ لاہور ۔ ۵/-
۲۱۔ " محمد ارشاد صاحب۔ کلڑہ گلی۔ تحصیل مری ۔ ۵/-
۲۲۔ " ملک حنیف وجدانی صاحب۔ موہڑہ سیداں (مری) ۔ ۵/-
۲۳۔ محترمہ رابعہ ڈار صاحبہ ۔ لندن ۔ (انگلینڈ) ۔ ۱۰۵/-
۲۴۔ محترم بشیر احمد صاحب۔ ملکوال ۔ ۵/-

نوٹ: قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور کو دیئے گئے عطیات۔ ایس۔ آر۔ او نمبر ۷۵ K/۱۹۶۵/۷۴ مورخہ ۴ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ I بوجہ شق ۱۳ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۱۵ ۔ ب کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

(سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ رجسٹرڈ۔ لاہور)

ایک اور شمع بجھ گئی

حال ہی میں ایک دوست کے خط سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف (حیدرآباد دکن) ہیں، اکتوبر ۱۹۷۱ء میں انتقال کر گئے۔ پاکستان کی نئی نسل شاید ڈاکٹر صاحب مرحوم کے نام سے بھی آشنا نہیں ہوگی لیکن تقسیم ہند سے پہلے کا علم دوست طبقہ ان سے اچھی طرح متعارف تھا۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور انگریزی زبان کے وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ ان کے دل میں ملت کا بڑا درد تھا اور اسلامی اقدار سے انہیں والہانہ شیفتگی تھی جلوعِ اسلام سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور قرآن کریم سے گویا انہیں عشق تھا۔ انکا انگریزی ترجمہ قرآن (جو مولانا ابو الکلام آزاد کے ترجمان القرآن پر مبنی ہے) اسلوب نگارش کے اعتبار سے سہل ممتنع کی دلکش مثال ہے۔ آخری عمر میں قویٰ مضمحل ہوتے چلے گئے تھے لیکن قرآن کا مطالعہ اسی نسبت سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس جہت سے ہندوستان میں انکی ہستی مغتنمات میں سے تھی۔ انکی وفات سے وہاں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر کرنا مشکل ہے۔ خدا غریقِ رحمت کرے۔

چاروں طرف سے آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ:

- مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے ثابت کر دیا ہے کہ دو قومی نظریہ غلط ہے۔
- قائداعظمؒ نے خود اپنی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر میں اس سے رجوع کر لیا تھا۔
- قومیت کا مدار وطن کی جامعیت ہے، نہ کہ ایمان (نظریہ) کا اشتراک۔
- مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہیئے ورنہ رہا سہا پاکستان بھی ختم ہو جائے گا۔
- نظریۂ پاکستان محض ایک افسانہ ہے جس کی حقیقت کچھ نہیں۔
- انسانی زندگی میں کوئی قدر ناقابلِ تغیر نہیں۔ ہمیں اپنے فیصلے حالات کے مطابق کرتے رہنا چاہیئے۔
- اگر ہم پاکستان کی سلامتی چاہتے ہیں تو بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کر لینی چاہیئے۔
- پاکستان میں متعدد قومیتیں بستی ہیں اس لئے صوبائی خود مختاری ضروری ہے۔
- قائداعظمؒ زندہ رہتے تو وہ اسی قسم کا پاکستان بناتے۔

—— سوال یہ ہے کہ ——

اگر قائداعظمؒ زندہ رہتے تو وہ کس قسم کا پاکستان بناتے —— بالفاظ دیگر،

قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان کیا تھا

یہ وقت کا نہایت اہم سوال ہے جس کے صحیح جواب پر پاکستان کے مستقبل کا دار و مدار ہے۔ اور یہ جواب پرویز صاحب کی زیر طباعت تالیف میں ملے گا جس کا عنوان ہی

قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان

ہے۔ کتاب شروع اپریل تک شائع ہو جائے گی۔ ضرورت ہے کہ اسے قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں عام کیا جائے کہ پاکستان کے مستقبل کا انحصار ان کے زاویۂ نگاہ کی درستگی پر ہے۔

کتاب بڑے سائز کے ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے اور **قیمت** (اندازاً) **دس روپے** ہوگی۔ چونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے کتاب محدود تعداد میں چھپوائی گئی ہے اس لئے آپ اپنی فرمائش جلد بھیج دیجئے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام گلبرگ ۲ لاہور

تحریکِ پاکستان کی کہانی (۲)

طلوعِ اسلام کی زبانی

طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۱ء میں تحریکِ پاکستان کی تاریخ کے وہ مراحل سامنے لائے گئے تھے جو مسلمانانِ ہند کے کاروانِ ملی نے ۱۹۳۰ء سے وسط ۱۹۴۲ء تک طے کئے ... تھے۔ زیرِ نظر قسط میں ان واقعات کا اجمالی تذکرہ سامنے لایا جا رہا ہے جو جون ۱۹۴۲ء سے تقسیمِ ہند (۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) تک رونما ہوئے۔ اس سلسلہ میں دو باتیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ یہ تذکرہ تقسیمِ ہند کے فوری بعد مرتب کیا گیا تھا اور طلوعِ اسلام کے دورِ جدید کی اولیں اشاعت بابت جنوری، فروری ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اسے یہاں بلا تغیر و تبدل شائع کیا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ جن جماعتوں یا افراد کا کردار اس تذکرہ میں سامنے آئیگا اس کا تعلق تقسیمِ ہند سے پہلے دور سے ہے۔ اس کے بعد ان میں سے بعض کی روش میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا اس میں ذکر نہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ تذکرہ آغاز ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مطالعہ کے دوران اس حقیقت کو نظرانداز نہ کیجئے گا۔

اب ملاحظہ فرمائیے ۱۹۴۸ء میں شائع ..... شدہ تذکرہ کی قسط دوم۔

"۱۹۴۲ء میں جنگِ عالمگیر ثانی نازک ترین دور میں داخل ہو چکی تھی۔ جرمنی کاکیشیا کے پہاڑوں سے ہوتا ہوا ایران تک آ پہنچا تھا اور جاپان برما اور آسام کی سرحد پر پر تول رہا تھا۔ ہند شمال مشرق و مغرب کی طرف سے خطرہ میں تھا کہ اس کا تعاون حاصل کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ جنگ کے اختتام کے بعد ہندوستان کو خود مختاری دے دی جائے گی ۲۲ مارچ

کرپس تجاویز

۱۹۴۲ء کو سر سٹیفورڈ کرپس کو چند تجاویز دے کر ہندوستان بھیجا گیا تاکہ وہ ان کی بنا پر مساعی جنگ میں ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل کر سکیں۔ تجاویزِ کرپس میں پہلی بار "پاکستان" کا اصول تسلیم کیا گیا۔ ان میں وائسرائے کی مجلسِ انتظامیہ میں دفاع کے سوا تمام محکمے ہندوستانیوں کو دینے کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہندوستان کی یونین میں شرکت کے دس سال بعد کوئی صوبہ یونین سے علیحدہ ہو سکتا ہے اور یہ علیحدہ شدہ صوبے اپنا الگ وفاق بنا سکتے ہیں۔

کانگریس نے کرپس تجاویز کو محض اس لئے رد کر دیا کہ اس میں پاکستان کا اصول تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مسلم لیگ بھی انہیں منظور نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ان میں مسلمانوں کی علیحدہ ہستی اور ان کے حق خود ارادیت کو غیر مبہم طور پر منظور نہیں کیا گیا تھا۔ مسلمان کا کم سے کم مطالبہ پاکستان تھا جس سے کمتر کوئی چیز انہیں مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں ان تجاویز کو نامنظور کر دیا۔

ہندو راج مسلط کرنے کی آخری کوشش

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد برِ اعظم ہند کی سیاسیات میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جنگِ عالمگیر جس کا آغاز ڈینزگ سے ہوا تھا کرۂ ارض کے زیادہ سے زیادہ رقبے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی اور اس کی تباہ کاریوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ جرمنی مغربی یورپ کو تقریباً مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ فرانس کی عظیم الشان سلطنت پامال ہو چکی تھی۔ جرمن افواج روس میں فاتحانہ یلغار کر رہی تھیں۔ بلقان بیشتر تاخت و تاراج ہو چکا تھا۔ جاپان غیر معمولی اور غیر متوقع برق رفتاری سے برطانیہ کے "ناقابلِ تسخیر" بحری قلعہ سنگاپور کو سر کر کے اور برما اور جزائر انڈیمان پر قبضہ کر کے ہندوستان کے مشرقی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ جاپانی بمبار طیارے وزیگاپٹم اور کوکناڈا پر بم برسا کر جنگ ہندوستانی سرحدوں کے اندر لے آئے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سابق صدر سبھاش چندر بوس پُراسرار طریق پر غائب ہو کر جاپانی اسلحہ و تنظیم کی مدد سے ہندوستان پر حملہ کرنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ ہر محاذ پر انگریزوں کی پسپائی اور ہر معرکے میں ان کی شکست سے ہندوستانی عوام کا اعتماد متزلزل ہو چکا تھا۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ برطانوی سلطنت کا ستارہ اب زوال پذیر ہے اور اس کے زندہ رہنے کے کوئی آثار نہیں۔

اس صورتِ حالات سے انڈین کانگریس نے پورا فائدہ اٹھانا چاہا۔ کانگریس نے اس موقعہ کو انتہائی غنیمت سمجھا۔ اس سے پیشتر وہ (غیر مخلصانہ طور پر ہی) مسلمانوں سے اتحاد ضروری سمجھتی تھی۔ لیکن اب اُسے اپنی کامیابی کا اس قدر پختہ یقین ہو گیا تھا کہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کے تمام دروازے بند کر دیئے۔

مسلمان مارچ ۱۹۴۰ء میں اپنا سیاسی مؤقف پاکستان کی صورت میں متعین کر چکے تھے۔ ۱۹۴۲ء تک پاکستان مسلمانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ مسلمانوں کو یقین ہو چکا تھا کہ آزاد ہندوستان کے کانگریسی ڈھانچے میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ پاکستان اور مسلم لیگ کا دعوائے نمائندگی دلائل کے مرحلے سے گزر کر زندہ حقیقت بن چکا تھا۔ مسلم لیگ عملی طور پر دس کروڑ اسلامیانِ ہند کی قومی پارلیمان اور ان کی ملی آرزوؤں کی آئینہ دار بن چکی تھی۔

کانگریس نے اپنی متوقع کامیابی کے نشے میں اندھے ہو کر مسلمانوں کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا۔۔۔ کانگریس کے کمیونسٹ ارکان نے اسے اس کی غلطی اور مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کی ضرورت کا احساس کرانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ہندو راج کے تصور نے کانگریس کے اعلیٰ قائدین کو مبہوت کر دیا۔ مطالبہ پاکستان کی منطق کے سامنے کانگریس مجلسِ عاملہ کے ممتاز ترین رکن راجگوپال اچاریہ کو بھی اعترافِ حقیقت کرنا پڑا اور انہوں نے کانگریس پر زور دیا کہ پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن کانگریس کمیٹی نے الہ آباد میں جلسہ کر کے جگت نرائن کی یہ تجویز منظور کر لی۔

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی رائے ہے کہ ہندوستان کی کسی جزوی مملکت یا علاقہ واری وحدت کو ہندوستان کی یونین یا وفاق سے الگ ہو جانے کی اجازت دے کر ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی ہر تجویز ملک کے بہترین مفاد کے لئے انتہائی نقصان دہ ہو گی۔ اس لئے کانگریس ایسی کسی تجویز پر مفاہمت نہیں کر سکتی۔

گویا جو چیز مسلمانوں کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھی، کانگریس کو اسے بنائے گفتگو تسلیم کرنے سے بھی انکار تھا۔ اس نامعقول تجویز کی منظوری کے خلاف احتجاج کے طور پر راجہ گوپال اچاریہ اور بعد میں کمیونسٹوں کو بھی کانگریس سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔

۸ راگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں کانگریس کمیٹی کے ایک اجلاس میں انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دے۔ کانگریس کا اصرار تھا کہ جنگ اور اس کے بعد آزاد ہندوستان کی تمام ذمہ داری اسی کے سپرد کر دی جائے اور جب اس نے دیکھا کہ برطانوی حکومت دس کروڑ کی عظیم مسلم قوم کو نظر انداز کر کے اس کا یہ غیر منطقی مطالبہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تو مسٹر گاندھی کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ جس وقت مناسب سمجھیں "ہندوستان چھوڑ جاؤ" کے مطالبہ کی بنا پر "عام بغاوت" شروع کر دیں۔

چنانچہ عدم تشدد کے اس دیوتا کی قیادت میں ایک سرتاپا متشددانہ تحریک شروع کر دی گئی اور لندن کی بمباری پر آنسو بہانے والے مہاتما کے پیروکاروں نے فساد و خونریزی کا آغاز کر دیا۔ ریل کی پٹریاں اکھیڑ دی گئیں، گاڑیاں الٹی گئیں، ڈاک خانوں، تار گھروں، ریلوے اسٹیشنوں، بجلی گھروں اور مفاد عامہ کے دوسرے مرکزوں کو نذر آتش کیا گیا۔ سرکاری دفتروں پر حملے کئے گئے۔ انگریزوں کو قتل کیا گیا۔ بعض جگہوں پر انسانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

اس تمام تر کارروائی کا مقصد وحید یہ تھا کہ برطانوی حکومت کو اس مشکل وقت میں اور پریشان کیا جا سکے تاکہ وہ مرعوب ہو کر اپنی عافیت کی خاطر ہندوستان کے تمام اختیارات کانگریس کے حوالے کر دے۔

مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے خلاف شدید شکایات تھیں جن کی بنا پر انہوں نے جنگی کارروائیوں میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن مسلمان اس حقیقت کی طرف سے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے کہ اگر جنگ اس براعظم کی حدود میں داخل ہو گئی تو اس کی براہِ راست زد مشرقی و مغربی پاکستان پر پڑے گی، جس کی آزادی کے لئے وہ سرگرم عمل تھے۔ وہ کانگریس کی طرح اس جنگ کو غیروں کی جنگ سمجھ کر ..... بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے لیکن ان کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ ایک حاشیہ بردار کی حیثیت سے شریکِ جنگ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اسی وجہ سے مسلم لیگ نے جنگی کارروائیوں میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن وہ اس نازک وقت میں حکومت کو پریشان کر کے پاکستان کی سرحدوں کو معرض خطر میں نہیں ڈال سکتی تھی۔

اس کے علاوہ مسلمان یہ طور پر یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کی تحریک (یا بغاوت) انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں کے خلاف ہے کیونکہ کانگریس تخویف و ترہیب سے اپنا سیاسی تغلب سارے ہندوستان پر مسلط کرنا چاہتی تھی۔ کانگریس کی تحریک کی براہِ راست زد مسلمانوں پر پڑتی تھی اس لئے وہ من حیث القوم اس تحریک سے علیحدہ رہے۔

کانگریس کا "دوسرا محاذ"

کانگریس مجلس عاملہ کے تمام ارکان بشمول مسٹر گاندھی گرفتار کر لئے گئے لیکن کانگریس کے کچھ لیڈر جیلوں سے باہر رہے۔ ان میں راجگوپال اچاریہ، بھولا بھائی ڈیسائی کے علاوہ منشی، ڈاکٹر جان قابلِ ذکر ہیں۔ ان کانگریسی لیڈروں اور سر تیج بہادر سپرو۔ کے قماش کے "غیر جانبدار" ہندوؤں کے سپرد "دوسرا محاذ" تھا۔ ان لوگوں نے باہر رہ کر کانگریس تحریک سے ہمدردی، مسلم لیگ کی مخالفت اور مطالبۂ پاکستان کا استخفاف جاری رکھا۔ ان کی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کا کام ہندو پریس نے سرانجام دیا جس کا براعظم بھر میں وسیع جال بچھا ہوا تھا۔

حکومت کی جوابی متشددانہ کارروائی اور مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے عدم تعاون سے یہ تحریک اپنی موت آپ مر گئی۔ اور یہ ہنگامہ چند روز میں فرو ہو گیا۔

مسلمانانِ بنگال کے مصائب

۱۹۴۳ء کا سال مسلمانانِ بنگال کے لئے ایک دوہرا ابتلا دہا۔ کانگریس

کو ہر موقع اور ہر جگہ ایسے نام نہاد مسلمان بآسانی مل جاتے رہے ہیں جن سے ملتِ اسلامیہ میں انتشار پیدا کرنے اور مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنے کی خدمت لی جاتی رہی ہے۔ ۲۱ جولائی ۱۹۴۱ء کو لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند نے ایک قومی دفاعی کونسل قائم کی جس میں مسلم لیگ سے بالابالا سکندر حیات خان مرحوم وزیر اعظم پنجاب، مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال، سعد اللہ خان وزیر اعظم آسام اور دوسرے ممتاز مسلم لیگیوں کو شامل کر لیا۔ قائداعظم نے اس نامزدگی کو مسلم لیگ اور مسلمانوں کی توہین سمجھتے ہوئے دفاعی کونسل کے ان شرکاء سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کیا۔ سکندر حیات خان اور سعد اللہ خان جھک گئے لیکن مولوی فضل الحق اکڑ گئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے خلاف بغاوت کر دی۔ لیگ نے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی اور اُن کی وزارت سے تعاون چھوڑ دیا۔ مولوی فضل الحق نے بدترین مہاسبھائیوں سے رشتہ جوڑ کے بنگال کے مسلمانوں کو خوب ستایا۔ مولوی صاحب نے متوازی لیگ قائم کرنے اور جناح کی قیادت ختم کر دینے کی خاطر ہر وہ حرکت کی جو ان جیسا مغلوبِ جذبات شخص کر سکتا تھا۔ بنگالی مسلمانوں کو مسلم لیگ اور قائداعظم سے وفاداری کی پوری سزا دی گئی۔ آخر سولہ ماہ کے طویل دورِ ابتلا کے بعد اپریل ۱۹۴۳ء میں فضل الحق وزارت کا خاتمہ ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب کی سیاسی موت بھی واقع ہو گئی۔

"ڈان" کا اجرا

۱۹۴۱ء کے اواخر کا ایک قابلِ ذکر واقعہ انگریزی روزنامہ "ڈان" کا اجرا ہے۔ مسلمانانِ ہند کو اپنی سیاسی زندگی میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ان میں ایک بڑی مشکل پریس کی کمزوری تھی۔ اردو روزنامے خاصی تعداد میں موجود تھے اور وہ اپنی بساط کے مطابق خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ لیکن ان کے حلقے محدود تھے اور ترقی یافتہ اور منظم ہندو انگریزی پریس کے مقابلے میں ان کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ مسلمانوں کے جو انگریزی روزنامے یا ہفتہ وار اخبارات نکل رہے تھے۔ ان کی حیثیت بالکل مقامی تھی۔ ان میں دہلی کا ہفتہ وار "ڈان" بھی شامل تھا۔ اکتوبر میں وقت کی اہم ترین ضرورت کو پورا کرتے ہوئے "ڈان" کو روزنامہ کر دیا گیا۔ جسے قدرتی طور پر گوناگوں مواضعات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس سے مسلم قوم کو زبان مل گئی اور مسلمانوں کی آواز قائداعظم کے ذریعہ ایوانِ اعلیٰ اور بیرونِ ہند میں بھی سنی جانے لگی۔

کانگرسی دام میں لیگ کو پھانسنے کی چالیں

اگست ۱۹۴۲ء کے ہنگامے سے فضا میں جو ارتعاش پیدا ہوا تھا۔ وہ چند ماہ میں ختم ہو گیا۔ لیکن گاندھی کے زرخیز دماغ نے کانگرسی تحریک میں ازسرِنو جوش پیدا کر دی۔ چھ ماہ جیل میں گزارنے کے بعد گاندھی نے وائسرائے کو خط لکھا کہ اگر انہیں رہا نہ کیا گیا تو وہ مرن برت شروع کر دیں گے۔ قول و فعل میں اہنسا کے اصول پر عمل کرنے والے گاندھی کا یہ اہم حربہ ہے جو وہ اپنی اَن ہونی بات بجبر منوانے کے لئے اکثر استعمال کیا کرتے ہیں۔

"دوسرے محاذ کے ہندو راہنماؤں نے سر سپرو کی قیادت میں دہلی میں ایک کانفرنس منعقد کی تاکہ گاندھی کی رہائی کا مطالبہ کیا جائے۔ قائداعظم کو بھی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا کہ اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک حکومت سے زیادہ مسلمانوں کے خلاف ہے اس لئے جب تک مسٹر گاندھی اس تحریک سے دستبرداری کا اعلان نہ کریں، مسلم لیگ ان کی رہائی کی مساعی میں شریک نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک اصولی چیز تھی جس پر مسلم لیگ آخر تک قائم رہی۔ اور اس کے سوا اس کے لئے کوئی اور راہِ عمل بھی نہ تھی۔ لیگ کی اس اصول پرستی پر اس کے خلاف کذب و افترا کا سلسلہ تیز ہو گیا۔

اپریل ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس میں قائداعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں

مسٹر گاندھی کی عیارانہ حرکات کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ (گاندھی) بار بار وائسرائے کو لکھتے ہیں۔ اگر ان کی ذہنیت میں واقعی تبدیلی آچکی ہے تو وہ براہِ راست مجھے کیوں نہیں لکھتے؟ قائداعظمؒ نے فرمایا کہ اگر مسٹر گاندھی اس قسم کی کوئی چٹھی لکھیں تو حکومت اسے روک نہیں سکے گی اور اگر وہ روکے گی تو یہ ایک سنگین بات ہوگی۔

قائداعظم کو بدنام کرنے کے لئے مسٹر گاندھی کو ایک عمدہ موقع ہاتھ آگیا۔ انہوں نے جھٹ قائداعظم کے نام ایک خط لکھ دیا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ حکومت پیشتر ازیں متعدد بار جیل میں مسٹر گاندھی کے ساتھ ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کر چکی تھی لہٰذا اس نے یہ خط قائداعظم تک نہ جانے دیا۔ اب قائداعظم سے اجلاس لیگ میں اپنی تقریر کی روشنی میں یہ توقع کی گئی کہ وہ حکومت کی اس حرکت کے خلاف احتجاج کریں۔

اس چال سے مقصود مسلم لیگ کو حکومت سے متصادم کرنا تھا تاکہ مسلمان کانگرس کی دلدل میں پھنس کر اپنے موقف سے دور ہٹ جائیں۔ حالانکہ مسلم لیگ کے لئے حکومت کے ساتھ متصادم ہونے کا کوئی موقع نہ تھا۔ قائداعظم کے لئے احتجاج کی کوئی وجہ نہ تھی کیونکہ انہیں گاندھی کی چٹھی یا ان سے ملاقات کا شوق نہ تھا۔ بلکہ وہ بلند اور وسیع مقاصد کی خاطر گاندھی کو تبدیلیٔ قلب کی دعوت دے رہے تھے اور انہوں نے اس امر کی وضاحت اپنی تقریر میں بھی کر دی تھی کہ اگر مسٹر گاندھی میں واقعی تبدیلیٔ قلب پیدا ہو چکی ہے تو وہ اس قسم کی چٹھی لکھیں۔ چنانچہ سارے طوفان کے جواب میں قائداعظم نے ایک ہی بات کہی "تبدیلیٔ قلب کہاں ہے؟" قلب کی تبدیلی مفقود تھی لہٰذا قائداعظم نے کانگرس کے دام میں پھنسنے اور گاندھی کا آلۂ کار بننے سے انکار کر دیا۔

اس باب میں ایک ایسا واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کے تذکرہ سے ہماری روح کو دہری اذیت پہنچتی ہے۔ تحریک خاکسار کے متعلق طلوعِ اسلام کی روش ہر اس شخص کے سامنے ہے جس نے اس کی نشاۃ اولیٰ میں اس کا کبھی مطالعہ کیا ہو۔ طلوعِ اسلام کو اس تحریک سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن ہماری بدقسمتی سے بعد میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ یہ تحریک ہماری جانفزا آرزوؤں کا مدفن بن کر رہ گئی۔ زیرِ نظر واقعہ بھی اسی تاسف انگیز حقیقت کا چہرہ کشا ہے۔ مسٹر گاندھی کی مذکورہ صدر چال سے متاثر ہو کر علامہ مشرقی نے اپنے خاکساروں کو حکم دیا کہ قائداعظم کو خطوط اور تار روانہ کریں کہ وہ مسٹر گاندھی سے ضرور ملیں۔ ادھر سے اصرار اور دوسری طرف سے قائداعظم کے اس مسلک سے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ایسی فضا پیدا ہو گئی جس سے بعض خاکسار اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور انہی میں سے ایک نے ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو بمبئی میں قائداعظم پر قاتلانہ حملہ کر دیا[1]۔ اس حادثہ سے اسلامیانِ ہند میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن قائداعظم نے انہیں ضبط و تحمل کی ہدایت کی۔ مسلمانوں نے یومِ تشکر منایا کہ ان کی ایک اہم مصیبت اللہ تعالیٰ نے ٹال دی ہے ورنہ جنگِ پاکستان کے انتہائی عروج میں قائداعظم کی غیر حاضری ایک عظیم ترین المیہ ثابت ہوتی جس کے صدمے سے ملتِ اسلام شاید جانبر نہ ہو سکتی۔

اس المناک واقعہ کے بعد مسلم لیگ اور خاکساروں میں خلیج حائل ہو گئی اور مسلم لیگ کو بالآخر اپنے دروازے خاکساروں پر بند کرنے پڑے تاکہ ملت ان غلط اندیشوں سے محفوظ رہ سکے۔

خضرِ پنجاب

۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے احیاءِ نو کے بعد پنجاب میں کسی وقت بھی لیگ ایک زندہ جماعت نہیں بن سکی تھی۔ پنجاب مسلم لیگ کے قائد سکندر حیات خان تھے جو اتحاد پارٹی کو لیگ پر مقدم سمجھتے

[1] خاکساروں کی تنظیم کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ حملہ آور خاکسار نہیں تھا۔ (طلوعِ اسلام - ۱۹۷۱ء)

تھے۔ لیگ کی امداد ہو شہروں تک محدود تھی لیکن جس حد تک جماعتی تنظیم کا تعلق ہے وہ مفقود تھی۔ پنجاب لیگ کے ارباب اختیار نے تنظیم کی کوئی حقیقی کوشش نہ کی اور باعمل اور فعال مسلمان کارکن پنجاب لیگ کے حلقے سے عملی طور پر غائب تھے۔ اس افسوسناک کوتاہی کے خلاف پنجاب کا حساس طبقہ برہم تھا۔ لیکن ان کی آواز دوائر لیگ میں سنی نہیں جاتی تھی۔ مسلم لیگ ابھی اس قدر قوی نہ تھی کہ وہ پنجاب کے قائدین سے ٹکرا سکے۔ یا اُن سے سختی سے باز پرس ہی کر سکے۔

سکندر حیات خان کی ناگہانی موت کے بعد ان کے جانشین ملک خضر حیات خان کے ہاتھوں لیگ کی اور مٹی پلید ہوئی۔ مارچ ۱۹۴۳ء میں دہلی میں لیگ کونسل کے اجلاس میں پنجاب کی قیادت کے خلاف آواز بلند ہوئی جس کے جواب میں ملک خضر حیات نے وعدہ کیا کہ وہ صوبے میں لیگ کو ایک زندہ جماعت بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرینگے۔ اگلے ماہ میں لیگ کے سالانہ کھلے اجلاس میں انہوں نے اپنے اس وعدہ کو پھر دہرایا۔ لیکن ملک صاحب اس وعدے کو کسی وقت بھی پورا نہ کر سکے۔ قائداعظمؒ نے ملک صاحب کے وعدے پر انہیں کچھ عرصہ تک مہلت دی لیکن جب صورت حالات میں کوئی اصلاح نہ کی گئی تو آخر اپریل ۱۹۴۴ء میں قائداعظمؒ نے خضر حیات خان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی دورخی پالیسی کو ترک کر دیں۔ اسمبلی میں قاعدہ مسلم لیگ پارٹی" قائم کریں اور پنجاب وزارت کا نام مسلم لیگ وزارت رکھیں۔

قائداعظم کے ساتھ کچھ روز مذاکرات کے بعد خضر حیات خان نے اپنے غیر مسلم رفقاء اور گورنر گلینسی کے اشارے پر لیگ سے بغاوت کر دی اور قائداعظم کے مطالبے کے جواب میں یہ عجیب و غریب پوزیشن اختیار کی کہ وہ آل انڈیا معاملات میں لیگ کی تائید کریں گے لیکن صوبائی معاملات میں "بیرونی مداخلت" برداشت نہیں کرینگے۔ خضر حیات خان نے اواخر اپریل میں اپنے طرزِ عمل کے جواز میں چند ایک بیانات دیئے اور اس کے ساتھ ہی سردار شوکت حیات خان کو ایک عیسائی معلمہ کے معاملہ میں ایک مبینہ بے انصافی کی بنا پر وزارت سے برخاست کر دیا۔ سردار شوکت حیات خان کو اپنے والد سکندر حیات خان مرحوم کی وفات کے بعد فوجی ملازمت سے مستعفی کرا کر وزیر بنایا گیا تھا اور ایک خصوصی ہنگامی قانون کے ذریعے انہیں ووٹر بنا کر اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا تھا۔ انہوں نے خضر جناح مذاکرات کے دوران میں لیگ اور قائداعظم سے غیر مشروط وفاداری کا اظہار کیا اور یہی جرم تھا جس پر انہیں وزارت سے علیحدہ ہونا پڑا۔

مسلمانانِ پنجاب میں زندگی کی لہر

اپریل ۱۹۴۴ء کے اواخر میں سیالکوٹ میں پنجاب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ نامساعد حالات کی بنا پر یہ اجلاس دوبارہ ملتوی ہو چکا تھا لیکن خضر حیات خان کی غداری اور شوکت حیات خان کی برطرفی نے مسلمانانِ پنجاب کو غیر معمولی جوش سے بھر دیا۔ اس غیر معمولی جوش کا مظاہرہ سیالکوٹ میں کیا گیا۔ دراصل یہی دو امور سیالکوٹ کانفرنس کی کامیابی کا موجب ہیں۔

خضر حیات کی قیادت کے خلاف اب کھلی بغاوت ہو گئی اور اسمبلی میں پہلی بار مسلم لیگ پارٹی معرض وجود میں آئی۔ وزارتی پارٹی سے کئی ایک اہم ارکان مستعفی ہو کر مسلم لیگ پارٹی میں آ گئے۔ مسلم لیگ پارٹی کے ان ارکان نے جن کی تعداد ۲۳ تھی، سیالکوٹ کانفرنس میں شرکت کی۔ قائداعظم نے اپنی تقریر میں مذاکرات کی رفتار اور ملک خضر حیات کے طرزِ عمل پر ایک حقائق پرور تقریر ارشاد فرمائی۔

سیالکوٹ کانفرنس سے مسلمانانِ پنجاب کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مسلمانانِ پنجاب خضر حیات کے اس "احسان" کو بھول نہیں سکتے کہ انہوں نے ملت سے غداری کر کے قوم کو بیدار کر دیا۔ ورنہ پنجاب میں لیگ کبھی بھی ایک زندہ اور

عوامی جماعت نہ بن سکتی۔ پنجاب لیگ کے نوجوان قائدین افتخار حسین خان ممدوٹ، سردار شوکت حیات خان اور میاں ممتاز دولتانہ نے صوبے کے طول و عرض کا دورہ کر کے لیگ اور پاکستان کا پیغام دور دور تک پہنچایا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں پنجاب میں لیگ کا دور دور تک شہرہ ہو گیا۔ حزب مخالف میں رہ کر لیگی قائدین نے شب و روز کام کیا۔ خضر حیات خان کی بعد کی مزید حماقتوں نے لیگ کو مقبول عام جماعت بنانے میں اور مدد دی۔ اس مقبولیت کا عدیم النظیر مظاہرہ مسلمانان پنجاب نے انتخاباتِ عمومی میں کیا۔

لیگ کانگرس مفاہمت کی مساعی

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ راجگوپال اچاریہ اصول پاکستان تسلیم کر لینے کے حق میں تھے۔ وہ اس حقیقت کو جانپ چکے تھے کہ مسلمانوں کے مطالبۂ خود ارادیت کو اب ٹالا نہیں جا سکتا۔ انہوں نے کانگرس سے اپنی بات منوانے کی کوشش کی لیکن انہیں ناکامی ہوئی اور انہیں مجلس عاملہ سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں انہوں نے ایک تجویز پیش کی جو راجہ فارمولا کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے مسلمانوں کی "قطعی" اکثریت کے علاقوں کی علیحدگی کا اصول تو تسلیم کر لیا لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے جو طریق کار پیش کیا وہ مبہم تھا۔ اس ابہام کے علاوہ فارمولا کی ابتدائی شرط یہ تھی کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کی تائید و توثیق کرے گی۔ یہ ایک شرانگیز شرط تھی جس سے مقصود دنیا پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اب تک مسلم لیگ مطالبۂ آزادی کی مخالف رہی ہے۔ راجہ فارمولا میں حق علیحدگی صرف "علاقوں" کے لئے تسلیم کیا گیا تھا۔ حالانکہ مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے حق خود ارادیت طلب کر رہے تھے۔

۳۰ جولائی ۱۹۴۴ء کو لاہور میں مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں قائداعظم نے راجہ فارمولا کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جس تجویز کو "قرارداد پاکستان کا لب لباب" کہا جا رہا ہے وہ مسلم لیگ سے کانگرس کی قائدانہ حیثیت تسلیم کرانے کی عیارانہ کوشش ہے۔

۱۹۴۴ء کے اوائل میں مسٹر گاندھی کو خرابی صحت کی بنا پر غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا تھا۔ رہائی کے بعد انہوں نے حسب عادت حکومت اور مسلم لیگ سے علیحدہ علیحدہ سودا بازی شروع کر دی۔ وائسرائے کے ساتھ نامہ و پیام کرنے کے ساتھ ہی انہوں نے قائداعظم کے نام ذاتی پیغام میں ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ لیاقت علی خان کے الفاظ میں "مسٹر گاندھی چاہتے تھے کہ لارڈ ویول یہ محسوس کریں کہ اگر ان (مسٹر گاندھی) کی پیشکش کا دوستانہ جواب نہ ملا تو وہ مسلم لیگ سے اتحاد کر لیں گے۔"

بہرحال مسلم لیگ اتحاد اور باہمی افہام و تفہیم کی ہر دعوت کو لبیک کہنے کو تیار تھی۔ چنانچہ قائداعظم نے بخوشی مسٹر گاندھی سے ملاقات کرنا منظور فرما لیا۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں دونوں ممتاز راہنماؤں میں بمبئی میں مذاکرات شروع ہوئے لیکن حسب توقع بے نتیجہ ثابت ہوئے۔ تمہیدی ملاقات میں ہی قائداعظم نے محسوس کر لیا کہ مسٹر گاندھی سنجیدگی سے گفتگو نہیں کر رہے بلکہ وہ غیر جانبدار مبصرین سے اپنی نیک نیتی کا سرٹیفکیٹ لینا چاہتے ہیں۔ مسلم لیگ قائداعظم کو مکمل اختیارات دے چکی تھی اور قائداعظم نے ذمہ لیا تھا کہ وہ مسٹر گاندھی سے جو مفاہمت کریں گے مسلم لیگ اور مسلم قوم اس کو تسلیم کرے گی۔ لیکن مسٹر گاندھی نے اس قسم کی مفاہمت کے متعلق یہ یقین دلانے سے انکار کر دیا کہ کانگرس اس کو تسلیم کرے گی۔ چونکہ مسٹر گاندھی "انفرادی" حیثیت سے گفتگو کر رہے تھے، گفتگو سے مصالحت کو جاری رکھنے کی کوئی بنیاد نہ تھی کیونکہ گاندھی کی "انفرادی" حیثیت کے پیش نظر یہ گفتگو محض تضیع اوقات تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت کی گفتگو اس دل لگی سے کرنا گاندھی ہی کے شایان شان ہو سکتی تھی، تاہم قائداعظم نے گفتگو جاری رکھی لیکن آخر گفتگو اور خط و کتابت کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان کا حق علیحدگی مسٹر گاندھی کی زبان پر ہے

دل میں نہیں "؟

گاندھی جناح خط و کتابت کی اشاعت پر لاہور کے اخبار "سول" نے اداریہ تبصرہ میں لکھا تھا کہ نظریات، اختلاف سے قطع نظر خط و کتابت کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف ایک نہایت قابل اور ہوشیار وکیل ہے۔ اور دوسری طرف ایک نالائق اور اجڈ وکیل جو اپنے کیس کو بھی نہیں سمجھتا اور نہ اسے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مذاکرات اپنے مقاصد میں ناکام رہے لیکن اُن سے مسلم لیگ کا زاویہ نگاہ اور زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آگیا۔ اور یہ حقیقت بھی ظاہر ہوگئی کہ ہندو مسلم پرپیچ مسئلہ کو کانگرس کس قدر سنجیدگی اور دیانت سے طے کرنا چاہتی ہے۔ ان مذاکرات سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسٹر گاندھی کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان محض سیاسی سودا بازی کی خاطر پیش نہیں کیا گیا بلکہ یہ کم سے کم چیز ہے جس پر مسلمان راضی ہو سکتے ہیں۔ مسٹر گاندھی کو یہ بھی اعتراف کرنا پڑا کہ قائد اعظم آزادی ہند کے لئے اتنے ہی بیقرار ہیں جتنا کوئی بڑے سے بڑا کانگرسی۔

۱۹۴۵ء کے آغاز میں ہندو مسلم مفاہمت کی ایک اور کوشش کی گئی۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں مرکزی اسمبلی کانگرس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی آنجہانی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری لیاقت علی خان کے درمیان "لیاقت ڈیسائی فارمولا" طے پایا۔ جس میں پہلی بار کانگرس کی طرف سے عملی طور پر دو قومی نظریہ کی تائید کی گئی۔ اس مفاہمت میں یہ طے کیا گیا کہ مرکز میں مسلم لیگ اور کانگرس کی نمائندگی مساوی ہوگی حالانکہ پیشتر ازیں کانگرس مسلمانوں کو ان کے تناسب آبادی کے مطابق نیابت دینے کی بھی مخالفت کرتی رہی تھی۔ اس فارمولے پر عملی طور پر مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ اور کانگرس کو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا گیا۔

پہلی شملہ کانفرنس

وائسرائے ہند لارڈ ویول اس فارمولے کی روشنی میں آئینی و سیاسی تعطل دور کرنے کے ذرائع دریافت کرنے کے لئے لندن گئے جہاں سے واپسی پر ۱۴ جون ۱۹۴۵ء کو انہوں نے اپنی تجاویز کا اعلان کیا جن میں وائسرائے کی مجلسِ انتظامیہ میں سپہ سالارِ اعظم کے سوا تمام ارکان ہندوستانی (و پاکستانی) رکھنے کا اعلان اس اصول پر کیا گیا کہ مجوزہ مجلسِ انتظامیہ میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی مساوی ہوگی۔

"اعلیٰ ذات کے ہندو" کے الفاظ پر مسٹر گاندھی نے بہت پیچ و تاب کھائے اور اس سلسلے میں انہوں نے وائسرائے کو جو پیغامات بھیجے ان سے یہ حقیقت پہلے سے کہیں زیادہ آشکارا ہو گئی کہ مسٹر گاندھی اول و آخر ہندو ہیں اور ہندو کے سوا کچھ نہیں۔ بہرحال ویول تجاویز کے مطابق ۲۵ جون کو شملہ میں کانفرنس ہوئی۔ اس دوران میں کانگرسی قائدین رہا کئے جا چکے تھے۔ کانفرنس میں اور کانفرنس کے بعد بیت جناح مذاکرات میں اہم نزاعی امر یہ تھا کہ مجوزہ مجلسِ انتظامیہ کے مسلم ارکان کے انتخاب کا حق صرف مسلم لیگ کو ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندہ ہے۔ اس سلسلہ حقیقت کو کانگرس نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور پانچ مسلم ارکان میں سے دو غیر لیگی (یا بالفاظ صحیح کانگرسی) "مسلمان" ارکان کا مطالبہ کیا۔ کانگرس کے اس مطالبہ کا مطلب یہ تھا کہ مسلم لیگ کا تناسب ایک چوتھائی سے بھی کم کر دیا جائے۔

اس حیثیت کو مسلم لیگ کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ کانگرس نے اس موقعہ پر پھر "قوم پرست" مسلمانوں کو حرکت دی۔ وائسرائے نے کانفرنس میں شمولیت کے لئے گاندھی کو تو دعوت دے دی تھی لیکن کانگرس کے نمائشی صدر ابوالکلام آزاد کو بلانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس پر مسٹر گاندھی نے احتجاج کیا اور آخر آزاد صاحب کو بھی دعوت دے دی گئی "مولانا حسین احمد مدنی"

کانگرس کی امداد کو پہنچے۔ اور انہوں نے کانگرس کے پروردہ عناصر کو جمع کر کے ایک قرارداد منظور کی جس میں مسلم لیگ کے دعوائے نمائندگی کو چیلنج کیا۔

انگریزوں سے ہندوستان چھوڑ جاؤ" کا مطالبہ کرنے والے کانگرسی لیڈروں سے وزارت کی خاطر ہر وہ حرکت کی جو ان سے سرزد ہو سکتی تھی۔ مسلمانوں کی مساوی نمائندگی کے دعویٰ کو جھٹلانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے لارڈ ویول کے "خلوص" کی بھی مدح سرائی کی۔ انہیں یقین تھا کہ برطانوی حکومت مسلم لیگ کو نظرانداز کر کے تمام اختیارات کانگرس کو سپرد کر دے گی۔ قائداعظم نے یکم جولائی ۱۹۴۵ء کو مسٹر گاندھی سے اپیل کی کہ وہ اس کانفرنس کے جھمیلوں کو چھوڑ کر مسلم لیگ سے سمجھوتہ کر لیں کیونکہ ویول تجویز محض عارضی چیز ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ مسٹر گاندھی بعد میں پیش آنے والے اہم اور بنیادی مسائل کے حل کے لئے پاکستان تسلیم کر لیں لیکن کانگرس کو سارے ہندوستان کی وزارت کے خواب نظر آ رہے تھے۔ اس نے قائداعظم کی اپیل کا جواب دینے کی بجائے مرکزی کابینہ کے لئے اپنے وزراء کی فہرست بھی تیار کر لی۔

اس نازک موقع پر مسلم ہندوستان نے یک زبان ہو کر مسلم لیگ اور قائداعظم پر اعتماد کا اظہار کیا۔ مسلمانوں کی ہر چھوٹی بڑی مجلس، طلبہ کی انجمنوں، مسلم خواتین، علمائے کرام، صوفیائے عظام غرض ہر طبقہ اور ہر خیال کے مسلمانوں نے قائداعظم کو ہزاروں کی تعداد میں دھڑا دھڑ برقی پیغام بھیجنے شروع کئے۔ اور ان کی نقول وائسرائے اور صدر کانگرس کے نام بھی بھیجی گئیں۔ ان میں مسلم لیگ اور قائداعظم کی قیادت پر کامل اعتماد اور "قوم پرست" مسلمانوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا گیا۔

کانگرس کی ضد کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۴ جولائی ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔ شملہ کانفرنس نے بھی گمراہ مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور وہ جوق در جوق مسلم لیگ میں آنا شروع ہو گئے جن میں مرکزی اسمبلی کانگرس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر خان عبدالقیوم، میاں افتخارالدین صدر پنجاب کانگرس، ملک فیروز خان نون قابلِ ذکر ہیں۔ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔ کے اس روح پرور مظاہرے کے ساتھ علمائے کرام بھی میدان میں نکل آئے اور پیرانِ عظام نے بھی اس نازک وقت میں قائداعظم کی قیادت میں اپنی پوری طاقت صرف کرنے کا اعلان کر دیا۔ علمائے کرام نے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی صدارت میں اپنی قوتیں جمعیت العلمائے اسلام کی صورت میں مجتمع کیں۔

قوم کی طرف سے اس حوصلہ افزا جواب پر قائداعظم نے زیادہ یقین کے ساتھ دشمنانِ ملت کو چیلنج کیا کہ اگر انہیں مسلم لیگ کے دعوائے نمائندگی میں شک ہے تو اسی سوال پر انتخاباتِ عمومی میں مقابلہ کریں۔

شملہ کانفرنس کے دوران میں قائداعظم اور لارڈ ویول میں جو خط و کتابت ہوئی تھی وہ کانفرنس کی ناکامی کے ساتھ شائع کر دی گئی۔ لیکن صدر کانگرس اور لارڈ ویول کی باہمی خط و کتابت کی اشاعت مناسب نہ سمجھی گئی اور قائداعظم کے پیہم اصرار کے باوجود یہ دستاویز آج تک شائع نہیں ہو سکی۔

انتخاباتِ عمومی۔ معرکہ حق و باطل

ادھر ہندوستان میں شملہ کانفرنس کے بعد کا ہنگامہ بپا تھا، اُدھر انگلستان میں جنگِ عالمگیر کے بعد پہلے انتخابات میں چرچل کی حکومت کا تختہ الٹایا جا چکا تھا، اور کلیمنٹ ایٹلی کی قیادت میں مزدور حکومت برسرِ اقتدار آ چکی تھی۔ مسلم لیگ کی طرف سے انتخاباتِ عمومی کا مطالبہ زیادہ شدت سے پیش ہونے لگا۔ لیکن کانگرس اس آزمائش کو ٹالنا چاہتی تھی۔ آخر وائسرائے نے نئے انتخابات کا اعلان کر دیا اور اس سلسلے میں وہ نئی مزدور حکومت سے مشورہ کرنے کے لئے لندن گئے۔

قائداعظم نے قوم کو آنے والی آزمائش کی اہمیت واضح کرتے ہوئے بتایا کہ یہ انتخابات ان دو سوالوں پر لڑے جارہے ہیں۔

(اول) مسلمان مسلم لیگ کو اپنی نمائندہ جماعت سمجھتے ہیں۔ اور

(دوم) مسلمان پاکستان چاہتے ہیں۔

یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی لیکن قائداعظم کو کامیابی کا پورا یقین تھا۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو انہوں نے کوئٹہ میں ارشاد فرمایا:-

ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ ہم کامیاب رہیں گے۔

اس کے مقابلے میں ۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو جواہر لال نہرو نے لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

اگر ہم نے انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا تو ہم اس کی پوری تیاری کریں گے۔ اور جو کوئی ہماری مخالفت کرے گا ہم اسے کچل دیں گے۔ ہم لڑنا جانتے ہیں۔ ہم نے حکومتِ برطانیہ سے بھی لڑائی کی ہے۔

کانگرس نے براہ راست مسلم لیگ کا مقابلہ کہیں بھی نہ کیا۔ بلکہ اُس نے ہر اس امیدوار کی حمایت کی جو مسلم لیگ کے مقابلے میں کھڑا ہو۔ سب سے پہلے مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا۔ تیس مسلم نشستوں میں سے کانگرس نے ایک کے لئے بھی اپنا امیدوار کھڑا نہ کیا۔ میدان سے اس فرار کے باوجود کانگرس نے مخالفین لیگ کی پوری امداد کی لیکن حق و باطل کے اس معرکے میں کانگرس اور اس کے حاشیہ برداروں کو منہ کی کھانا پڑی۔ تیس کی تیس نشستوں پر مسلم لیگ نے کانگرس کے پروردہ جمعیۃ العلماء، احرار، خاکسار، مسلم مجلس اور دوسری "قوم پرست" مجالس کے امیدواروں کو چاروں شانے چت گرادیا۔ نصف سے زیادہ حریفوں کی ضمانتیں تک ضبط ہوگئیں۔ ایک قریب خوردہ حسین بھائی لال جی نے قائداعظم کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں بلکہ گستاخی کی لیکن ۳۷۰۲ کے مقابلے میں وہ صرف ۱۲۷ ووٹ لے سکا۔ دوسرے حلقے میں اسے صرف ۸۳ ووٹ مل سکے۔

اس طرح مسلم لیگ نے ایک ایسی کامیابی حاصل کی جو آج تک دنیا کی کوئی سیاسی پارٹی حاصل نہیں کرسکی۔ لیکن شپرہ چشم اب بھی حقیقت کو نہ دیکھ سکے اور اس فتح مبین کے بعد بھی کانگرس اور اس کے حلیفوں کو یقین نہ آسکا کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ سردار پٹیل نے "میں نہ مانوں" کی ایک عمدہ مثال پیش کرتے ہوئے اعلان کیا کہ مسلم لیگ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں کامیابی پر اترا رہی ہے جہاں حق رائے دہندگی محدود تھا۔ صحیح فیصلہ تو صوبائی انتخابات میں ہوگا۔ تب ہم دیکھیں گے کہ پاکستان کس طرح قائم ہوتا ہے اور مسلم لیگ کس طرح یوم فتح کی تقریب مناتی ہے۔"

اس دوران میں کانگرس کو ایک اور شوشہ ہاتھ آگیا۔ جاپان اتحادی طاقتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا تھا اور سوبھاش چندر بوس کی "آزاد ہند فوج" اتحادیوں کے رحم و کرم پر تھی۔ خاتمۂ جنگ تک "آزاد ہند فوج" ایک مذاق معلوم ہوتا تھا۔ لیکن برطانوی حکومت نے بعض ان بوجھی مصلحتوں کی بنا پر اسے غیر ضروری اہمیت دے دی۔ چنانچہ جاپان کی شکست کے بعد پہلی بار دنیا کو یقین کرنا پڑا کہ بوس کی یہ "فوج" ایک ہوتا ہے۔ حکومت نے اس کے منتظمین کے خلاف مقدمے چلائے۔ کانگرس شملہ کانفرنس پوری طرح بے نقاب ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کا اعتماد تو وہ کب کا کھو چکی تھی۔ ہندو بھی کانگرس کی رجعت قہقری کو ناپسند کرتے تھے۔ ان غیر مطمئن اور مایوس عناصر کو پرچانے کے لئے آزاد ہند فوج کا ڈھونگ کھڑا کر دیا گیا۔ یہ دراصل کانگرس کا انتخابی نعرہ تھا۔ کانگرس کے پروگرام میں ہنگامہ اور شور و شغب کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیگ کے دوسرے حریف اس معاملے میں بالکل بے مایہ تھے۔ ان کے پاس کوئی پروگرام، کوئی نصب العین نہ تھا۔ اس کے مقابلے میں لیگ کے پاس ایک واضح نصب العین اور ٹھوس پروگرام تھا۔

کانگرس نے خلاف لیگ عناصر کو تھپکی دی۔ "مولانا" ابوالکلام صدر کانگرس نے اعلان کیا۔

صوبائی مجالس آئین ساز میں ہم ہر مسلم نشست پر مقابلہ کریں گے اور غیر معمولی کامیابی حاصل کریں گے۔

"مولانا" نے یہ بھی اعلان کیا کہ جس نشست پر کوئی کانگرسی امیدوار نہیں ہوگا وہاں ہر اس امیدوار کی حمایت کی جائے گی جو مسلم لیگ کے مقابلے میں کھڑا ہوگا۔ چنانچہ کانگرس نے بدترین قسم کے رجعت پسندوں، ٹوڈیوں اور سرکار پرستوں کی امداد کی تاکہ لیگ کو شکست دی جا سکے۔ قائداعظم کو کافر اعظم "کہا گیا۔ مسلم لیگ کی" غیر اسلامی "حیثیت کو آشکارا کیا گیا۔ ہر جگہ مسلم لیگ کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ کارکنانِ لیگ کو" زیرِ عتاب "کیا گیا۔ پنجاب کی" اسلامی "وزارت نے خدا، رسول، مذہب اور قیامت کا نام لینے پر مسلمانوں کو ایک ایک سال کی قید کی سزا دینا شروع کر دی۔ مسلمانوں سے حمایت لیگ کا انتقام یوں لیا گیا کہ اناج اور دوسری ضروریاتِ زندگی سے ان کو محروم کر دیا گیا۔ لیکن تحقیر، تخویف و تحریص کی ہر کوشش ناکام و نامراد ہوئی۔ اور جب صوبائی انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو دشمنانِ ملت ارشادِ خداوندی کے مطابق غصے سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگے۔

بمبئی، مدراس اور اڑیسہ میں مسلم لیگ نے سو فیصدی کامیابی حاصل کی۔ آسام میں ۳۴ میں سے ۳۱، بنگال میں ۱۲۲ میں سے ۱۲۲۔ بہار میں ۴۰ میں سے ۳۰، یو۔پی میں ۶۶ میں سے ۵۵، پنجاب میں ۸۶ میں سے ۸۰۔ سندھ میں ۳۵ میں سے ۲۸۔ اور سرحد میں ۳۸ میں سے ۱۷، اور سی۔ پی میں ۱۴ میں سے ۱۳ نشستیں جیتیں۔ انتخابات کے فوراً بعد لیگ کے متعدد مخالف ارکان لیگ میں آ گئے جس سے لیگ کی کامیابی کا فیصدی تناسب اور زیادہ ہو گیا۔

منافقین کے کارنامے

لیگ کی اس عظیم الشان اور فقید المثال کامیابی سے ایوانِ باطل متزلزل ہو گیا۔ اسلامیانِ ہند اس عظیم آزمائش سے سرخرو نکلے۔ اب دشمنانِ ملت نے اپنی تمام تر قوتیں اس امر پر مرکوز کر دیں کہ مسلمانوں کو صوبائی انصرام سے محروم رکھا جائے۔ پنجاب میں یہ مقدس "خدمت سرانجام دینے کے لئے" امام الہند "تشریف لائے۔ انتخابات سے پہلے ملک خضر حیات خان نے اعلان کیا تھا کہ اگر مسلم لیگ نے انتخابات جیت بھی لئے تو وزارت میری ہی بنے گی۔ لوگ ملک صاحب کے اس خیال کا مذاق اڑاتے تھے کیونکہ بظاہر یہ بات مشکل معلوم ہوتی تھی۔" مولانا "آزاد نے خضر حیات کا یہ خواب درست کر دکھایا۔ انہوں نے ۸۰ ارکان کو نظر انداز کر کے پانچ ارکان کی" پارٹی "کے لیڈر کو کانگرس اکالی پارٹی اور ختم شدہ اتحاد پارٹی کے لیگ دشمن محاذ کا لیڈر تسلیم کر لیا۔ اور رسوائے عالم گورنر گلینسی کے ہاتھوں ایک اقلیتی وزارت اس صوبے پر مسلط کرا دی جس کی اکثریت مسلم لیگ پر اعتماد کا اظہار کر چکی تھی۔

سندھ میں بھی کانگرس نے صرف تین ارکان کی "پارٹی" کے لیڈر جی۔ ایم۔ سید کو اپنا لیڈر بنا لیا تاکہ مسلم لیگ کی واضح اکثریت کو ناکارہ کیا جا سکے۔ لیکن اتفاق سے سندھ کا گورنر ایک آزاد رو اور منصف مزاج شخص تھا جس نے صوبائی حکومت کا حق اصلی حقداروں کے سپرد کر دیا۔ بعد میں سندھ نے ان بچے کھچے منافقین کو بھی صوبائی سیاست سے بیدخل کر دیا۔

وزارتی مشن

انتخاباتِ عمومی کے ہنگامے کے فوراً بعد برطانوی مزدور حکومت نے مسئلہ ہند کے تصفیہ کے لئے ایک اہم اقدام کیا۔ وزیراعظم ایٹلی کے وعدے کے مطابق "ہندوستان کو آزادی کے حصول میں پوری پوری مدد دینے کے لئے" ۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو لندن سے ایک وزارتی مشن بھیجا گیا جس کے ارکان وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس، وزیر تجارت سر سٹیفورڈ کرپس اور وزیر البحر مسٹر الیگزینڈر تھے۔ وفد بھیجنے سے پیشتر مسٹر ایٹلی نے اعلان کیا کہ اس مرتبہ اقلیت کو اکثریت کے سیاسی ارتقاء کے راستہ میں روڑا نہیں بننے دیا جائے گا۔ یہ اعلان برطانوی حکومت کے سابقہ اعلانات کے خلاف تھا۔ کانگرس

کو اس سے یقین ہو گیا کہ اب مسلم لیگ کو ضرور نظر انداز کر دیا جائے گا اور حکومت کے کلی اختیارات کانگرس کے حوالے کر دیئے جائینگے۔

وزارتی مشن نے مختلف سیاسی جماعتوں سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ قائداعظم نے مصالحت کی خاطر محدود مرکز بھی قبول کر لیا لیکن کانگرس اپنی ضد پر اڑی رہی جس سے مذاکراتِ دہلی ناکام رہے۔

ان مذاکرات کے دوران میں دہلی میں مرکزی و صوبائی مجالس مقننہ کے نئے منتخب مسلم لیگ ارکان کی ایک تاریخی کنونشن منعقد ہوئی جس میں اسلامیانِ ہند کے نمائندوں نے ایک بار پھر اپنے اس عقیدے کا واشگاف اعلان کیا کہ مسلمان پاکستان سے کم تر کوئی چیز قبول نہیں کرینگے۔ مختلف صوبوں کے نمائندوں نے حصولِ پاکستان کے لئے ہر قسم کی قربانی کی پیشکش کی اور قائداعظم نے قوم کے سامنے دو راہیں پیش کیں ــــ "پاکستان یا شہادت"!

مذاکرات دہلی کے بعد شملہ میں کانفرنس کی گئی جس میں برطانوی حکومت کے نمائندوں کے علاوہ مسلم لیگ اور کانگرس کے نمائندوں نے شرکت کی۔ دونوں سیاسی جماعتوں کے نمائندے جب آپس میں کوئی مفاہمت نہ کر سکے تو ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی وفد نے اپنا فیصلہ شائع کیا جس میں مرکز میں فوری طور پر عارضی حکومت کی تشکیل کے علاوہ صوبوں کی گروہ بندی کی تجویز پیش کی گئی۔

گروہ بندی کی تجویز کے مطابق ہندوستان کے صوبوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ الف گروہ میں مدراس، بمبئی، یو۔ پی۔ بہار، اڑیسہ اور سی۔ پی۔ ب گروہ میں پنجاب، سرحد اور سندھ۔ ج گروہ میں بنگال اور آسام شامل کئے گئے۔ یہ گروہ بندی لازمی رکھی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہر صوبے کو اختیار دیا گیا کہ نئے دستور کے ماتحت پہلے انتخاب عمومی کے بعد وہ اپنے گروہ سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔ آئندہ دستور کی تشکیل کے لئے مجلسِ دستور ساز کا خاکہ بھی پیش کیا گیا۔

ان سفارشات کے متعلق مسلم لیگ کا ردِ عمل ۵۔ جون تک معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن کانگرس کیطرف سے فوری طور پر غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا گیا۔ مسٹر گاندھی نے اسے بہترین تجویز کہا۔ ایک ہندو نامہ نگار کی اطلاع کے مطابق جب یہ تجویز نشر ہو رہی تھی تو سننے والے یقین نہیں کر سکتے تھے کہ برطانوی حکومت کیطرف سے اتنی اچھی تجویز پیش ہو سکتی ہے۔ ہندو لیڈروں کو یقین ہو گیا کہ "پاکستان کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا ہے۔"

ہندوؤں کا یہ تمام جوش مسرت عارضی ثابت ہوا۔ انہیں اطمینان تھا کہ مسلم لیگ اس تجویز کو رد کر دے گی اور کانگرس بلا شرکتِ غیرے ہندوستان کی مالک بن جائے گی۔ لیکن ۶ جون ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیگ کونسل نے جب اس تجویز کو یہ کہہ کر منظور کر لینے کا فیصلہ کر لیا کہ اس میں پاکستان کی بنیاد موجود ہے تو ہندو دنیا کی تمام خوشی ماتم میں تبدیل ہو گئی۔ اب انہیں اس تجویز میں نقائص و عیوب ہی نظر آنے لگے۔ چنانچہ کانگرس نے صوبوں کی جبری گروہ بندی اور مرکز میں ہندو مسلم مساوات کو قابلِ اعتراض قرار دیتے ہوئے ۲۵ جون ۱۹۴۶ء کو وزارتی تجاویز کے استرداد کا فیصلہ کر دیا۔ حالانکہ اس سے ایک سال پیشتر کانگرس مساوات کے اصول کو تسلیم کر چکی تھی۔ کانگرس نے استرداد کے فیصلے کو "منظوری" کہنے پر بے جا اصرار کیا۔

برطانوی حکومت کی عہد شکنی

وائسرائے نے ۱۶ جون ۱۹۴۶ء کو اعلان کیا کہ مرکزی حکومت کی تشکیل ضرور کی جائے گی۔ اگر کوئی سیاسی جماعت اس میں شرکت سے انکار کر دے گی تب بھی دوسرے عناصر کے تعاون سے مرکزی حکومت ضرور بنائی جائیگی۔ اس واضح اعلان کے بعد مرکز میں حکومت کی تشکیل مسلم لیگ کا حق تھا جو وزارتی تجاویز کو تسلیم کر چکی تھی۔ لیکن کانگرس کے استرداد کے ساتھ ہی حکومت نے عارضی حکومت کی تجویز کو معرضِ التوا میں ڈال دینے کا اعلان کر دیا جو وائسرائے کے اعلان کی صریح خلاف ورزی تھی۔ اس دوران میں کانگرس اور وائسرائے

میں درپردہ سودا بازی ہوئی۔ چنانچہ جب عارضی حکومت کی تجویز کو ملتوی کیا گیا تو کانگرسی حلقوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کیا کہ اگلی دفعہ جب مرکزی حکومت کی تجویز پیش ہوگی تو اس سے عدم تعاون کرنے والی جماعت کانگرس نہیں ہوگی۔ اس دوران میں مسٹر گاندھی اور برطانوی نمائندوں میں خفیہ نامہ و پیام کا سلسلہ بھی جاری رہا جس کی تفاصیل آج تک دنیا کو معلوم نہیں ہو سکیں۔

فیصلہ بمبئی

برطانوی حکومت کی اس صریح وعدہ شکنی کے علاوہ جبری گروہ بندی کے متعلق جو وضاحت ذمہ دار وزراء اور وائسرائے نے کانگرس کی غوغا آرائی سے متاثر ہو کر کی۔ اس سے مسلمانوں کے دلوں میں برطانوی حکومت کے عزائم پر شبہ ہونے لگا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ہندوستان اور انگلستان کے بنیوں نے درپردہ مسلمانانِ ہند کی قسمت کا سودا کر لیا ہے۔ اس درپردہ کارگزاری اور برطانوی حکومت کی بدعہدی نے اسلامی ہند میں ہیجان پیدا کر دیا اور ہر طرف سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کر کے نئی صورتِ حالات کی روشنی میں اپنے طرزِ عمل پر نظرثانی کی جائے۔ کیونکہ اب اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا کہ وزارتی تجاویز کا تمام شور و شر مسلمانوں کو پھانسنے کی ایک عیارانہ چال ہے۔

چنانچہ جولائی ۱۹۴۶ء کے اواخر میں بمبئی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بلایا گیا جس میں متفقہ طور پر وزارتی تجاویز کو مسترد کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس استرداد کے علاوہ یہ بھی طے کیا گیا کہ "آئینیت" کا دور ختم کر کے آزاد و خود مختار پاکستان کے لئے براہِ راست اقدام کیا جائے۔ ایک قرارداد کے ذریعے مسلم لیگ کے ارکان سے مطالبہ کیا گیا کہ برطانوی حکومت کی بددیانتی کے خلاف احتجاج کے طور پر اس کے عطا کردہ خطابات ترک کر دیئے جائیں۔ چنانچہ بڑے بڑے "ٹوڈیوں" اور "سرکار پرستوں" نے ملت کا اشارہ پاتے ہی غلامی کے یہ تمغے انگریزی حکومت کے منہ پر دے مارے اور ایک ہی جھٹکے میں لیگ ایک بہت بڑی لعنت سے پاک ہو گئی۔ کئی ایک حضرات نے سرکاری جاگیریں تک واپس کر دیں اور اس طرح مسلم عوام کے سامنے قربانی و ایثار کی ایک عمدہ مثال پیش کی۔

قوم نے براہِ راست اقدام کے فیصلے کا خیر مقدم انتہائی گرمجوشی سے کیا۔ قوم پاکستان کے لئے اس آخری جہاد کے لئے اپنا سب کچھ نثار کرنے کو بے تاب تھی۔ وہ صرف اپنے محبوب قائداعظم کے "بزن" کے حکم کی منتظر تھی۔ قوم کی یکجہتی اور تیاری کا اندازہ کرنے کے لئے قائداعظم نے ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو "ڈائریکٹ ایکشن ڈے" (یوم عمل) منانے کا ارشاد کیا تاکہ مسلمان اس روز ہڑتال، جلسوں، جلوسوں اور پرامن مظاہروں سے اپنی وحدتِ عمل کا ثبوت دیں۔ اس روز اسلامیانِ ہند نے اپنے جوش و خروش اور اس کے ساتھ ضبط و نظم کا بے مثل مظاہرہ کیا۔

سوئے ہوئے شیروں کی یہ انگڑائی دشمنانِ ملت کو کیسے بھا سکتی تھی۔ ہندوستان بھر میں ہر چھوٹے بڑے قصبے میں "یوم عمل" دھوم دھام سے اور پرامن طریق پر منایا گیا۔ لیکن کلکتہ میں مسلمان جلوس میں شامل ہونے کے لئے جا رہے تھے کہ غنڈوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ مسلمان اس کے لئے تیار نہ تھے اس لئے ابتدائی مرحلے میں انہیں بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ انہوں نے سنبھل کر مدافعانہ کارروائی کی۔ کچھ روز کلکتہ میں وسیع پیمانے پر کشت و خون ہوا۔ ہزاروں بے گناہ انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ہزاروں زخمی ہوئے۔ کلکتہ کی لاکھوں عمارتیں خاکستر کر دی گئیں اور یہ خوبصورت شہر درندوں اور وحشیوں کی بستی بن گئی۔

ہند کا یوم سیاہ

اس تباہ کاری اور ہلاکت آفرینی سے ہندوستان کی عارضی حکومت کا استقبال ہوا۔ جو کانگرس اور وائسرائے ویول کی ملی بھگت سے مرکز میں مسلم لیگ کے تعاون کے بغیر ۲ ستمبر کو

ترتیب دی گئی۔ انسانی حقوق کے محافظ اعلیٰ پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں مرتب شدہ حکومت کا پہلا کارنامہ مجاہدین سرحد پر بمباری تھی۔ ہندو سامراج کے عزائم کا یہ پہلا شرمناک مظاہرہ تھا۔

مرکز میں تغلب حاصل کرنے کے بعد کانگرسی وزراء نے تمام محکموں کو مکمل طور پر ہندو بنانے کی مہم پوری جرأت کے ساتھ شروع کر دی۔ مسلم لیگ مسلمانوں کو یوں پامال ہوتا ہوا دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس موقع پر نواب بھوپال میدان میں نکلے اور لیگ کانگرس مفاہمت کے لئے انہوں نے شب و روز ایک کر دیئے۔ ان کی مساعی سے جناح نہرو ملاقات کا انتظام ہوا لیکن حسب توقع یہ ملاقاتیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں مسٹر گاندھی نے نواب بھوپال کو لکھ کر دے دیا کہ وہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرتے ہیں۔ جب مسٹر گاندھی کی یہ دستاویز منظر عام پر آئی تو کانگرسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ پنڈت نہرو نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا اور آخر "سنیہ" کے دیوتا کو یہ کھلا جھوٹ بول کر مخالفت کے اس طوفان کو دبانا پڑا کہ میں نے دستخط کرنے سے پہلے دستاویز کو اچھی طرح پڑھا نہیں تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے دستخط کر کے غلطی کی۔ اس کے کچھ روز بعد نواب بھوپال اور مسٹر گاندھی میں کئی ایک ملاقاتیں ہوئیں جن میں اقوام ہند کی قسمت کے فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ہی مسئلہ زیر بحث رہا کہ محولہ فوق دستاویز واپس کر دی جائے۔

عارضی حکومت میں لیگ کی شرکت

وائسرائے اور قائداعظم کے مابین مزید خط و کتابت کے نتیجے کے طور پر مسلم لیگ نے بلا شرط عارضی حکومت میں شامل ہونا منظور کر لیا تاکہ کانگرسی حکومت کو یکطرفہ کارروائیوں سے روکا جا سکے۔ عارضی حکومت میں شمولیت کے وقت مسلم لیگ نے اقلیت نوازی کا ایک بے مثل مظاہرہ کیا اور اپنے حصے میں سے ایک نشست اچھوت کو دے دی حالانکہ پیشتر ازیں کانگرس اچھوتوں کو مرکزی کابینہ میں جائز نمائندگی دینے سے انکار کر چکی تھی۔

مسلم لیگ کے اس اقدام سے کانگرسی لیڈر بہت سٹپٹائے اور انہوں نے آئینی حجت بازیوں سے لیگ کو باہر رکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مستعفی ہونے کی دھمکی بھی دی لیکن انہیں حکومت کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اب وہ اسے چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ بہرحال عارضی حکومت میں لیگ کی شمولیت کانگرسی عزائم پر ایک ضرب کاری تھی جس نے کانگرس کا سارا پروگرام درہم برہم کر دیا۔

کانگرس نے مرکز میں برسراقتدار آتے ہی مجلس دستور ساز کا اجلاس شروع کر دیا اور لیگ کے کامل عدم تعاون کے باوجود دستور سازی کی کارروائی جاری رکھی گئی۔ صوبوں کی گروہ بندی کے متعلق کانگرس کے طرز عمل کے پیش نظر لیگ دستور کی ترتیب میں شریک نہیں ہو سکتی تھی۔ لیگ کے عدم تعاون سے مجلس دستور ساز محض ایک مذاق بن چکی تھی اور عارضی حکومت میں لیگ کے تعاون سے پنڈت نہرو کی قیادت ختم ہو چکی تھی۔

المیہ بہار

کلکتہ میں ہندوؤں کی دراز دستی نے مسلمانوں کو غیظ و غضب سے بھر دیا تھا۔ لیکن اپنے قائد کے حکم کے مطابق وہ پُرامن رہے۔ بنگال کے مشرقی اضلاع میں بعض جوشیلے مسلمانوں نے کچھ انتقامی کارروائی کی لیکن حکومت بنگال کے سخت اقدامات سے یہ بدامنی زیادہ بڑھ نہ سکی۔ نواکھلی کے اس مقامی واقعے سے کانگرس نے پورا فائدہ اٹھایا۔ مسٹر گاندھی نے حکومت بنگال کی غیر ضروری مہمان نوازی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نواکھلی میں جا کر وہاں کے واقعات کے متعلق مبالغہ آمیز داستانیں نشر کرنا شروع کیں۔ صدر کانگرس اچاریہ کرپلانی نے افسانہ تراشی میں اپنے گرو کے بھی کان کتر دیئے۔

نواکھلی کے متعلق گاندھی، کرپلانی اور دوسرے غیر ذمہ دار کانگرسی راہنماؤں اور اخبارات کے مبالغہ آمیز بیانات

نے بہار کے ہندوؤں کو جوشِ انتقام میں اندھا کر دیا۔ کانگرسی حکومت کی سرپرستی میں پولیس اور فوج کی عملی اور سرگرم امداد سے بیخبر اور نہتے مسلمانوں کی بستیوں کو گھیر کر پچاس ہزار مسلمانوں کو انتہائی سفاکی سے شہید کر دیا گیا۔ ۱۹۴۶ء کی عید قربان پر، جبکہ مسلمانانِ ہند جانوروں کی قربانی دے کر سنتِ خلیل تازہ کر رہے تھے، بہار کے مسلمان اپنی جانوں کی قربانی پیش کر رہے تھے۔ مسلمانانِ ہند اس سانحۂ عظیم پر پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ ان کا خون اپنے مسلمان بھائیوں کے بہیمانہ قتل پر کھول رہا تھا لیکن انہوں نے صبر و ضبط سے کام لیا اور پُرامن رہے۔ وہ مجبور تھے تاہم انہوں نے ان مصیبت زدگان اور خانماں برباد بھائیوں کی امداد کے لئے وہ سب کچھ کیا جو ان سے بن پڑتا تھا۔ قائداعظم کی اپیل پر تھوڑے سے عرصے میں مسلمانوں نے پچاس ہزار روپے کی رقم خطیر جمع کر لی۔ یہ رقم اس مدد کے علاوہ تھی جو گرم کپڑوں، کمبلوں اور دوائیوں کی صورت میں پہنچائی گئی۔ اس کے علاوہ ہزاروں مسلم نوجوانوں نے بہار جا کر عملی طور پر اپنے بدحال بھائیوں کی رضاکارانہ خدمت کی۔ بنگال اور سندھ کے مسلمانوں نے مسلم مہاجرین کو دعوت دے کر "انصار و مہاجرین" کی مواخات کی تجدید کر دی۔

سندھ کی فتح مبین

صوبائی انتخابات کے سلسلے میں ذکر ہو چکا ہے کہ سندھ میں کانگرس نے جی۔ ایم سید کو تھپکی دینا شروع کر دی تھی تاکہ مسلمانوں کی وحدت میں رخنہ پیدا کیا جا سکے۔ ۱۹۴۶ء کے اواخر میں سندھ کی مسلم لیگ وزارت ان رخنہ اندازیوں سے ڈانواں ڈول ہو گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حزبِ مخالف اور وزارتی پارٹی کے ارکان کی تعداد اسمبلی میں برابر ہو گئی۔ اس آئینی تعطل کو دور کرنے کے لئے صوبے میں نئے انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ مسلم لیگ کو شکست دینے کے لئے تمام مسلم دشمن قوتیں اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ اس مختصر سے صوبے میں جمع ہو گئیں۔ لیکن تائیدِ ایزدی سے باطل کے بچے کھچے تنکے بھی رائے عامہ کے سیلِ بے پناہ میں بہ نکلے اور مسلم لیگ نے ۳۷ میں سے ۳۵ نشستوں پر قبضہ کر لیا۔

لندن کانفرنس

بہار کے المیہ اور سندھ کی فتح مبین نے لندن کانفرنس کی راہ ہموار کر دی جس کی تجویز قائداعظم نے پیش کی تھی۔ وزارتی مشن کی تجاویز کے متعلق کانگرس، مسلم لیگ اور حکومتِ برطانیہ میں جو اختلاف پیدا ہو گیا تھا، اس کو رفع کرنے کی آخری کوشش کی گئی اور وزیراعظم برطانیہ کی دعوت پر لندن میں ایک کانفرنس طلب کی گئی جس میں حکومت کے نمائندوں کے علاوہ قائداعظم، لیاقت علی خان، جواہر لال نہرو اور بلدیو سنگھ نے شرکت کی۔ بہار اور سندھ کے واقعات نے حقائق پوری طرح واضح کر دیئے تھے۔ چنانچہ ان کی روشنی میں اور قائداعظم کے بے مثل زورِ استدلال سے حکومت کو مسلم لیگ کا نقطۂ نظر تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن کانگرس کی روزافزوں ہٹ سے ہندوستان کی مجلس دستور ساز میں مسلم لیگ کی شرکت کی راہ ہموار ہو گئی۔ لندن کانفرنس کے دوران میں پٹیل نے جو زہریلی اور امن سوز تقریریں کیں ان سے مسلمانانِ ہند کے شبہات میں اور اضافہ ہوا اور باہمی مصالحت کے امکانات ختم ہو گئے۔ لندن میں منہ کی کھا کر ہندو کانگرس نے نام نہاد مجلس دستور ساز کا اجلاس طلب کیا لیکن مسلم لیگ اپنے فیصلے کے مطابق اس میں شریک نہیں ہوئی۔

رائے عامہ کا سیلاب

انتخاباتِ عمومی میں یونینسٹ پارٹی کو شکست فاش دینے کے باوجود مسلمانانِ پنجاب کے مصائب کا خاتمہ نہ ہوا۔ کانگرس، اکالیوں، مسلمان منافقین اور گورنر گلینسی کی ملی بھگت نے مسلمانانِ پنجاب کی شامتِ اعمال خضر حیات کی صورت میں ان پر مسلط کر دی۔ خضر حیات اپنے غیر مسلم وزراء اور گورنر کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھا جس کے سبب پنجاب میں عملی طور پر کانگرس کی حکومت مسلط ہو گئی۔ حکومت کے ہر شعبے سے مسلمانوں کو کلی طور پر بے دخل کرنے کے بعد کانگرس حکومت نے مسلمانوں کی جائز سرگرمیوں پر چھاپہ مارنا شروع کر دیا۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس

کے لئے لاہور کا منٹو پارک استعمال کرنے کی اجازت نہ دی گئی تاکہ اس میدان کی مقدس گھاس جسے سکھ اور دیگر مویشی پیشتر ازیں اپنے اجتماعات میں پامال کرچکے تھے، مسلمانوں کے پاؤں تلے روندی نہ جائے۔ دفعہ ۱۴۴، اور پنجاب پبلک سیفٹی آرڈیننس اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو یک لخت بلاوجہ صوبہ بھر میں مسلم نیشنل گارڈز کو خلاف قانون قرار دے کر مسلم لیگ کے تمام ممتاز رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔

پنجاب کے مسلمانوں کے لئے حکومت کے یہ اقدامات امتحان بھی تھے اور چیلنج بھی۔ مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ لیکن خدشہ یہ تھا کہ اس زبردست آزمائش میں مسلمان کیسے پورے اتریں گے۔ لیکن مسلمان عوام و خواص نے کامل ۳۴ دنوں تک جس عدیم النظیر یک جہتی، ولولۂ عمل اور جوش و خروش سے سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا اس کی داد مخالفین بھی دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ غیر فرقہ وارانہ اور غیر متشددانہ تحریک اپنی قسم کی پہلی تحریک تھی۔ جس میں دیہاتی عوام نے بھی نمایاں حصہ لیا اور کامل ضبط و نظم کے ساتھ۔ اس تحریک کے دوران میں مسلمانوں کو متفرق قسم کے مصائب جھیلنے پڑے۔ حکومت نے تحریک کو ناکام کرنے کی ہر کوشش کی لیکن تحریک کا زور بڑھتا گیا۔ آخرکار حکومت کو رائے عامہ کی بے پناہ طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے اور مسلم لیگ کو تمام پابندیوں سے آزاد کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے ہر پنجابی کو شہری حقوق واپس دلا دیئے اور اس طرح وہ ایک کڑی آزمائش سے سرخرو نکلے۔

انہی دنوں سرحد اور آسام کے مسلمانوں کو بھی اپنے جائز حقوق کی حفاظت کے لئے حکومت سے متصادم ہونا پڑا۔ دونوں صوبوں کی تحریکیں کافی طوالت پکڑ گئیں۔ لیکن مسلمانوں کے عزم و حوصلہ میں کمی واقع نہ ہوئی۔ آخر نئی آئینی تبدیلیوں کے پیش نظر یہ تحریکیں بند کرنا پڑیں۔

فسادات پنجاب

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم برطانیہ نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ برطانیہ جون ۱۹۴۸ء .... تک تمام اختیارات اہالیان ہند کے حوالے کر دے گا۔ ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو مسلمانان پنجاب نے اپنی تحریک کے کامیاب خاتمہ پر یوم فتح منایا۔ اس کے فوراً بعد خضر وزارت نے استعفیٰ دے دیا۔ مسلمان خوش تھے کہ ان کے مصائب بالآخر ختم ہونے والے ہیں۔ لیکن ہندو اور سکھ لیڈروں کی آتشبار تقریروں نے پنجاب کو بہت جلد جہنم زار بنا دیا۔ ۴ مارچ کو لاہور میں فساد کی آگ بھڑکائی گئی جس نے بڑھتے بڑھتے تقریباً سارے صوبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لاہور، امرتسر، راولپنڈی اور ملتان خاص طور پر اس کے شکار ہوئے۔ ہر جگہ فساد کی ابتدا غیر مسلموں نے کی۔ اور مسلمانوں نے اپنی حفاظت کی خاطر جوابی کارروائی کی۔

فسادات کے بعد کا دور مسلمانان پنجاب کے لئے ایک دہشت زدگی کا دور تھا۔ مارچ کے بعد پنجاب میں کچھ ماہ کے لئے عملی طور پر سکھا شاہی رہی۔ صوبے کی عنان حکومت ایک آمر گورنر جنکنز کے ہاتھ میں تھی جو اپنے سیہ کار پیشرو کا بدترین جانشین ثابت ہوا۔ خضر وزارت کے استعفیٰ کے بعد بھی اس نے مسلم لیگ کو وزارت سازی کا موقعہ نہ دیا حالانکہ لیگ اسمبلی میں واضح اکثریت کی دعویدار تھی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ضلع راولپنڈی کے مسلمانوں نے غیر مسلموں پر مظالم کئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس علاقے میں فسادات کے بعد فوج اور سول حکام کی سرپرستی میں جتنا نقصان جان و مال مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑا، اتنا نقصان فسادات کے دوران میں ہندوؤں اور سکھوں کا نہیں ہوسکا۔ مارچ کے افسوسناک واقعات کے بعد مسلمانوں کو من حیث القوم غنڈہ اور مجرم سمجھ لیا گیا تھا جن کے لئے حکومت کے قانون میں کوئی پناہ نہ تھی۔ بہرحال راولپنڈی کے مسلمانوں کے لئے یہ ایک ابتلائے عظیم تھا جسے انہوں نے غیر معمولی صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کیا۔

اس کے فوراً بعد گوڑگاؤں کی مسلم اقلیت کو منظم غنڈہ گردی کی آماجگاہ بنایا گیا اور اسی کے ساتھ بھرت پور اور الور

کی ریاستوں میں بھی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ یہاں کی مسلم رعایا کو یا تو بالجبر ہندو بنا لیا گیا یا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کلکتہ میں بھی غنڈہ گردی معمول بن گئی۔

تقسیمِ ہند کا اعلان

۳ر جون ۱۹۴۷ء کو ہند کی نئی آئینی تبدیلیوں کے متعلق تاریخی سرکاری اعلان ہوا جس میں تقسیمِ ہند کے ساتھ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی تجویز بھی پیش کی گئی۔ اس اعلان کو مسلمانوں، ہندوؤں، اور سکھوں کے نمائندوں نے تسلیم کر لیا۔ اس اعلان میں بلوچستان، سرحد اور سلہٹ سے اس سوال پر استصواب رائے کرنے کی تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ ان تینوں علاقوں کے فیصلے مسلمانوں کے لئے جتنے حوصلہ افزا تھے اتنا ہی دل شکن اس حد بندی کمیشن کا فیصلہ تھا جو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے انگریز صدر سر سرل ریڈکلف نے تقسیم اور حد بندی کے تمام مسلّمہ اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پنجاب اور بنگال کا مسلم اکثریت کا کثیر علاقہ پاکستان سے چھین کر ہندوستان کو دے دیا۔ مسلمانوں کے لئے ریڈکلف کا فیصلہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا لیکن چونکہ مسلمان راہنما اس کی قبولیت کا وعدہ قبل از وقت کر چکے تھے اس لئے ناچار انہیں یہ تلخ گھونٹ پینا پڑا۔ یہ صریح بے انصافی انگریز ہندو سازش کا نتیجہ تھا جس کے خدوخال حالیہ واقعات نے پوری طرح نمایاں کر دیئے ہیں۔

پاکستان زندہ باد!

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو (۲۷ رمضان المبارک) دو نئی مملکتوں — آزاد پاکستان اور آزاد ہندوستان — کا قیام عمل میں آیا۔ اس روز پاکستان و ہندوستان میں صدیوں کی غلامی سے نکلنے کے بعد خوشی کے جشن منائے گئے۔ ۱۸ر اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں آزادی کی پہلی عید منائی گئی۔ ریڈکلف فیصلہ اور پنجاب کے روز افزوں فسادات سے مسلمان افسردہ خاطر ضرور تھے لیکن وہ اس احساس کو چھپا نہیں سکتے تھے کہ وہ پہلی بار آزاد فضا میں عید منا رہے ہیں۔ اس قسم کا پہلا موقع "ہر شخص کی زندگی میں نہیں آیا کرتا۔

مسلمانوں کا قتلِ عام

آزادی کی خوشیوں کا شور ابھی فضا میں گونج رہا تھا کہ مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں، پٹیالہ، کپورتھلہ، فریدکوٹ اور نابھہ سے مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانے پر قتلِ عام کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ دہلی سے کراچی آنے والی پاکستانی سپیشل گاڑی پر حملہ کیا گیا اور اس کے بعد ہر سواری گاڑی کو روک کر مسلمان مسافروں کو قتل کرنے کی باقاعدہ مہم شروع کر دی گئی۔ مسلمانوں کو قبل از وقت غیر مسلح کر دیا گیا۔ ہندو اور سکھ پولیس اور فوج کی سرپرستی میں آزاد ہند فوج اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے سورماؤں نے ہر قسم کے جدید آلاتِ جنگ رائفل، برین گن، مارٹر، ریوالور، بم اور مشین گن کی مدد سے چند دنوں کے اندر ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ ہزاروں مسلمان عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ زندہ مسلمان یا تو بصد مشکل پاکستان پہنچ گئے یا زبردستی شدھ کر لئے گئے۔ اب مسلمانوں کی کروڑوں روپوں کی جائیداد پر ان ظالمین کا غاصبانہ قبضہ ہے۔

مشرقی پنجاب میں اپنی مہم کامیابی کے ساتھ ختم کرنے کے بعد ہلاکت و تباہ کاری کی یہ قوتیں ہندوستانی یونین کے صدر مقام دہلی میں سرگرمِ عمل ہو گئیں۔ وہاں خون آشام کالی دیوی کی پوجا کا جشن منایا گیا اور چند روز میں پچاس ہزار مسلمانوں کو خاک و خون میں لوٹایا گیا۔ مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ بچے کھچے مسلمان انتہائی خستہ حالت میں پاکستان پہنچے۔ دہلی میں مسلمانوں کا صفایا کرنے کے بعد ان خون آشام درندوں نے یو۔پی کا رخ کیا۔ مغربی یو۔پی سے بھی مسلمانوں کو ختم کر دیا گیا۔

الغرض قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہوا تاریخِ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہنی بال، ہلاکو، چنگیز

نادر وغیرہ کے قتلِ عام اس کے سامنے بے حقیقت ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج ہمارے سینے ان جگر گداز اور لرزہ خیز واقعات سے فگار ہو رہے ہیں۔ پاکستان کو ان باقی ماندہ لاکھوں مسلمانوں کی بحالی کا اہم کام درپیش ہے جو اپنی زندگی کی ساری متاع لٹا کر صرف اپنی جان بچا کر یہاں پہنچے ہیں۔ پاکستان کے جو ذرائع نوزائیدہ مملکت کی ترقی و ترفیع کے لئے صرف ہونے والے تھے اب وہ زخمی دلوں کو مرہم مہیا کرنے کے لئے مخصوص ہو چکے ہیں۔

جونا گڑھ، کشمیر

پاکستان کی مشکلات کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا۔ جوناگڑھ اور مانادار کی ریاستوں نے بخوشی پاکستان میں شرکت کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن ہندوستانی یونین پاکستان کے علاقے میں اس اضافے کو برداشت نہ کر سکی اور اس نے ان ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمتِ ماضی کی ایک یادگار ریاست حیدرآباد باقی رہ گئی ہے جسے بجبر ہندوستان میں شامل کرنے کی تدابیر ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کا ابتلا یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ ہندوستانی حکومت نے حال ہی میں کشمیر پر جو حملہ کیا ہے وہ مسلمانوں کے لئے ایک اور بہت بڑی آزمائش ہے۔ کشمیر، پونچھ اور جموں میں ڈوگرہ گردی اپنی پوری ہولناکیوں سے سرگرمِ عمل ہے جسکے اعمالِ سیاہ کو چھپانے کے لئے ہندوستانی یونین کے ہوائی جہازوں کا سایہ کر دیا گیا ہے۔ اب تک ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان اس خطۂ جنت نظیر میں موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ مجاہدینِ کشمیر اپنی آزادی اور سلامتی کے لئے کفن بردوش اور شمشیر بکف میدان میں نکل آئے ہیں۔ اس وقت کشمیر میں ظلم و انصاف کی ٹکر ہے۔ ظلم کی پشت پناہ فوجیں اور آلاتِ حرب ہیں، اور انصاف کی پشت پر مسلمانوں کے جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت کے علاوہ دستِ غیب ہے۔ پاکستان اپنی گوناگوں مشکلات کے سبب اس تصادم کا خاموش تماشائی ہے۔ وہ بوجوہ مجاہدین کی عملی امداد نہیں کر سکتا۔ ہاں اس کی اخلاقی امداد تمام تر مجاہدین کے ساتھ ہے۔ مسلمانانِ کشمیر نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيبٌ کی بشارت پر موت کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی پریشانی

ہندوستان میں دہشت زدہ اور ہراساں مسلمانوں کی زندگی اجیرن ہو رہی ہے۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی اور حاکموں کی فرعونیت اور دراز دستی نے ان میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔ ہندوستانی حکومت ان سے عجیب و غریب قسم کی وفاداری کی توقع رکھتی ہے۔ ان کے جان و مال و آبرو کی حفاظت کے لئے ان کی خودداری اور غیرت کی قیمت طلب کی جاتی ہے۔ ملازمتوں سے مسلمانوں کو بے دخل کر دیا گیا ہے۔ اعادہ کے لئے ان پر تمام راہیں بند کرنے کے لئے ملازمتوں میں نشستوں کی تخصیص اٹھا دی گئی ہے۔ جداگانہ حقِ انتخاب اور تحفظات کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے سکولوں کو سرکاری امداد بند کر دی گئی ہے کیونکہ یہ سکول "قومیتِ متحدہ" کی تشکیل میں حارج ہیں۔ ذبیحۂ گاؤ کی قانونی بندش کر دی گئی ہے اور اس طرح مسلمانوں کو ایک جائز چیز کے استعمال سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ہندی زبان سرکاری و عدالتی زبان قرار دے دی گئی ہے۔ ملازمتوں کے لئے ہندی سیکھنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری سے حکومت بری ہو چکی ہے اور انہیں اپنی حفاظت کا خود انتظام کرنے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ ان کو کلی طور پر غیر مسلح کر دیا گیا ہے اور اس طرح انہیں غنڈوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان غنڈوں کی گرفت کے لئے کوئی قانون موجود نہیں۔

مسلمانوں کے اس انتشار سے کئی دنیا پرست، وقت شناس اور ابن الوقت اشخاص کو اپنی دکان پھر چمکانے کا موقع مل گیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی بے بسی و بے چارگی کو اپنے مقاصدِ مشئومہ کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ ابوالکلام آزاد جنہیں سیاسی شدھی کے بعد اپنی "خطا کار" قوم کے قریب آنے کی کبھی توفیق نہ ہوئی، آج دہلی کی جامع مسجد میں کھڑے ہو کر مسلمانوں کی زبوں حالی پر طعنہ زنی کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں لاکھوں مسلمان بھائیوں کے بیدردانہ ذبح ہو جانے کا رنج نہیں بلکہ انہیں خوشی ہے کہ

مسلمان ان کی قیادت سے سرتابی کے جرم عظیم میں پٹ رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو استہزاء آمیز تبسم سے کہہ رہے ہیں "ہم تمہیں گزشتہ بیس سال سے نہیں کہہ رہے تھے کہ تمہارا یہی حشر ہوگا!" "مولانا" کو اطمینان ہے کہ اب وہ کانگرس کے حاکمانہ اقتدار کے بل بوتے پر اپنی پامال شدہ قیادت کو پریشان روزگار مسلمانوں پر ٹھونپ سکیں گے۔

لیگ کی تقسیم

قیادت کی اس ہوس کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں سے بنوک شمشیر یہ کہلوایا جارہا ہے کہ انہوں نے لیگ کا ساتھ دے کر سخت غلطی کی ہے۔ مذہبی بنیادوں پر تنظیم کو جرم قرار دیا جارہا ہے۔ مسلمانوں کے اس انتشار کے پیش نظر "آل انڈیا" مسلم لیگ کی کونسل کا ایک اہم اجلاس ۱۴ اور ۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں منعقد ہوا جس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ چونکہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان و ہندوستان کی حیثیتوں اور دونوں نئی مملکتوں کے مسلمانوں کے مسائل میں نمایاں تغیر پیدا ہوگیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی اس اہم سیاسی تنظیم کو پاکستان مسلم لیگ اور ہندوستان مسلم لیگ میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ہندوستانی مسلمان بدلے ہوئے حالات کے مطابق اپنی ملی پالیسی کی تشکیل کر سکیں اور مسلمانوں کے انتشار سے وہ لوگ فائدہ نہ اٹھا سکیں جو مسلمانوں کے مصائب پر اپنی قیادت کا ایوان تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

اواخر دسمبر میں "مولانا" آزاد نے اپنے ہم خیال مسلمانوں اور چند دہشت زدہ مسلم لیگی راہنماؤں کی ایک کانفرنس کی جس میں مذہبی بنیادوں پر قائم شدہ جماعتوں کی مخالفت کرتے ہوئے مسلمانانِ ہندوستان کو مشورہ دیا گیا (یا حکم؟) دیا گیا کہ وہ بلا شرط کانگرس میں شامل ہوجائیں۔ یہ کانفرنس اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ کیونکہ مسلم لیگ نے بحیثیت جماعت اس کا مقاطعہ کیا۔ ہندوستان کے مسلمان اب بھی مسلم لیگ ہی کو اپنے دکھوں کا علاج سمجھتے ہیں اور ہما کی عدم موجودگی میں "سایہ بوم" گوارا نہیں کر سکتے۔

(اس مضمون میں تقسیم ہند سے متعلق واقعات کا سلسلہ وار بیان تو آگیا ہے مگر ان پر تبصرہ نہیں آسکا۔ یوں بھی ان واقعات کے پس منظر میں اس کی گنجائش نہیں تھی چونکہ تقسیم سے متعلق مسائل نہایت اہم ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ انہیں اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے اس لئے ان پر علیحدہ مفصل تبصرہ ہم آئندہ پرچوں میں شائع کریں گے۔)

(یہ تحریک پاکستان کے پس منظر کا دوسرا حصہ ہے جسے جنوری ۱۹۴۸ء میں شائع کیا گیا تھا۔ طلوع اسلام ۱۹۷۱ء)

(پیغام)

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی معرکہ آرا کتاب

PHENOMENA OF NATURE AND THE QURAN

ملنے کا پتہ:
(۱) ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور
(۲) مکتبہ دین ودانش۔ چوک اردو بازار لاہور

قیمت:
۲۵/-
پچیس روپے

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

نہ جلالِ پادشاہی نہ جمہوری تماشا

[محترم ڈاکٹر صاحب نے یہ مقالہ طلوع اسلام کنونشن کے لئے ارقام فرمایا تھا، جسے دسمبر ۲۰۰۵ء کے آخری ہفتہ میں منعقد ہونا تھا۔ چنانچہ بوجوہ یہ کنونشن منعقد نہ ہو سکی اور یہ مقالہ اس میں نہ پڑھا جا سکا۔ اب اسے زینت وہ اوراق طلوع اسلام کیا جا رہا ہے۔ (طلوع اسلام)]

"طلوع اسلام نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے نہ سیاسی جماعت" یہ بات آپ نے بارہا طلوع اسلام کے لٹریچر اور رسالے کی پیشانی پر پڑھی ہو گی لیکن پچھلے دو تین سال سے ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہونیوالی سب چیزوں میں سرفہرست یہی سیاست ہے آپ بے شک کسی پارٹی میں شامل نہ ہوں اس کے اثرات سے فرار ممکن نہیں اس لئے میں نے اپنے لئے یہ موضوع چنا تاکہ اپنے طور پر ہم سوچ سکیں کہ ہمارے اردگرد یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے اور اس کو بہتر طور پر سلجھانے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہو گا۔

طلوع اسلام کے سٹیج پر ان باتوں کی چھان پھٹک اور اپنے انفرادی رائے کے اظہار پر کوئی پابندی بھی تو نہیں اور اسے ایک ایسی فراخدلی بھی حاصل ہے جو دوسرے کسی سٹیج کو حاصل نہیں۔

مجھے احساس ہے کہ میرا علم بہت محدود اور میری سوچ بڑی معمولی ہے۔ لیکن اس ملک پر نازل ہونے والی ہر مصیبت مجھ پر بھی اسی طرح اثر انداز ہوتی ہے جیسے ہر دوسرے شہری پر، اسی لئے اس محفل میں جو کچھ بھی میں کہنا چاہتا ہوں اسے صرف ایک شہری بلکہ غریب شہری کی بات سمجھ کر توجہ دیجئے۔

فرد اور جماعت کا باہمی ربط ہی سیاست کا محور ہے: جب تک انسان تہذیب سے روشناس نہیں ہوا تھا۔ وہ اکیلا دکیلا رہتا تھا اور ہر شخص اپنے فیصلے خود کرتا تھا۔ کسی سے اس کا کوئی تصادم نہ تھا۔ مگر جب وہ مل جل کر رہنے لگے تو مختلف انسانوں کے فیصلے آپس میں ٹکرانے لگے کیونکہ ان کے مفادات کا یہ تقاضا تھا۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو ان میں اولین ٹکراؤ بھی دراصل مفادات کا ٹکراؤ تھا۔

روز روز کے جھگڑوں سے بچنے کے لئے انہوں نے سوچا کہ کوئی ایسا انتظام کرنا چاہیے جس سے معاملات لڑائی جھگڑے کی بجائے کسی قاعدے اور قانون کے مطابق طے پایا کریں۔ اس طرح یہ نظام جو بعد میں جا کر نظام سیاست بنا، معرض وجود میں آیا۔

قبائلی نظام میں قبیلے کا سردار اطاعت کا مرجع تھا اور اس کا فیصلہ تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ قبیلے کا سردار وہی ہوتا

تھا جو قوت میں سب سے زیادہ ہوتا تھا اور ہر کوئی اس سے خوف کھاتا تھا۔

انسانیت کے طفولیت کے زمانے ہی میں آدمی نے یہ دیکھا کہ ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں قبیلے کا سردار بھی بے بس ہو جاتا ہے۔ کوئی بیرونی طاقت ایسی ہوتی تھی جس کے خلاف وہ کچھ نہ کر سکتا تھا ---- کوئی پتھریلے علاقے کا رہنے والا سب سے اونچی چٹان پر ایستادہ سب سے بڑے پتھر کی ہیبت سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گیا اور اس نے اس کی پوجا شروع کر دی۔ کسی نے دریا کی تباہ کاریوں کو دیکھ کر اس کے سامنے جھکنا شروع کر دیا اور اس طرح آگ، پانی، بجلی، بادل، دریا، سانپ دیوی دیوتاؤں میں بدل گئے اور انسان کے معبود ٹھہرے۔

اور کبھی یوں ہوا ہوگا کہ دیوتا کے سامنے جھکنے کے باوجود کسی پر آئی مشکل نہ ٹلی ہوگی اور اس مایوسی میں اسے دوسرے ساتھی نے یہ بتایا کہ دیوتا کو خوش کرنے کا جو طریقہ تم نے اختیار کیا وہ درست نہ تھا، درست طریقہ میں بتاتا ہوں اور اس کا بتایا ہوا طریقہ اتفاق سے بارآور ہو گیا۔ یہاں سے وہ طبقہ پیدا ہوا جس نے بتایا کہ اسے دیوی دیوتاؤں کا قرب حاصل تھا ---- قبیلے کا سردار بھی ان کا محتاج، ان کی معرفت سے دیوی دیوتاؤں کے قرب کا محتاج تھا اور آہستہ آہستہ یہ قبیلے کے سردار سے بھی زیادہ اختیارات کے مالک ہو گئے۔ ان کے کہنے سے سرتابی کی مجال اسے بھی نہ ہو سکتی تھی، ان کے کہنے پر سرداران قوم کے بچے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھتے رہتے اور اس طرح انسانیت دوسرے بندھنوں میں بندھ گئی۔ یہی بندھن آگے چل کر تمدنی زندگی میں ملوکیت اور کلیسائیت کا روپ اختیار کر گئے۔

شروع کی زندگی میں زمین کی ملکیت کا تصور نہ تھا جب بادشاہت آئی تو ہر چیز اس کی ملکیت تصور ہونے لگی اور اس نے اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کے لئے زمین کے ٹکڑے بطور انعام اپنے ساتھیوں کو جو سرداران قوم کہلاتے تھے بانٹنے شروع کر دیئے اور یہاں سے انسانیت ایک تیسرے بندھن میں جکڑی گئی۔ اقتصادی بندھن۔

ان تینوں بندھنوں میں جکڑی ہوئی انسانیت نے جو صدیوں کا سفر اس کرۂ ارض پر طے کیا ہے یہ بڑی ہی دلگداز داستان ہے، شہنشاہوں کے ظلم، اس کے ساتھی امراء کی زیادتیاں اور ان زیادتیوں کے خلاف اٹھنے والے خیالات کو دبانے والے دیوی دیوتاؤں کے مقربوں کی چیرہ دستیاں جنہوں نے ان راج نیتاؤں اور سامنتوں کو دیوتا سروپ اور ظل اللہ بنا دیا اور اس کے بدلے میں بادشاہوں پر یہ دھونس جما کر کہ

تمہیں تو تم کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا　　　جناب ہم نے بتایا حضور ہم نے کیا

اپنے لئے عیش، سامانیوں کے مواقع پیدا کئے۔

اس دوران خدا کی طرف سے پیغمبر آتے رہے جو ان بھٹکے ہوئے، راہ گم کردہ انسانوں کو ان کی فلاح کا راستہ بتلاتے اور اس قافلے کی سمت متعین کرتے رہے ---- مگر ان کے جانے کے بعد یہی مفاد پرست عناصر ان کی تعلیمات کو بسا اوقات ان تعلیمات کے اجارہ دار بن کر لوگوں سے چھپاتے رہے کیونکہ یہ تعلیمات ان تمام طلسمات کے جال کو کاٹ کر رکھ دیتی تھیں، جو یہ بڑی محنت اور مکاری سے انسانیت کو پھانسنے کے لئے بنتے تھے۔

انہی معاشروں میں سوچنے والوں نے انسانیت کو نئی راہیں سجھانے کی کوششیں کیں، یہ پیغمبروں کی بچی کھچی تعلیم کا اثر تھا یا بےقرار انسانی سوچ کا کرشمہ جو اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتی فلاح کی راہ تلاش کرنے کی فکر میں رہتی ہے کہ دنیا میں انسانوں کے معاملات کو سنوارنے کے مختلف تجربے ہوتے رہے ---- شہنشاہیت کا شخصی استبداد، امراء

کا تسلط، کلیساؤں کا تغلب — ان راہوں سے گزرتے ہوئے انہوں نے دورِ حاضر میں وہ نظامِ سیاست اپنایا جسے وہ انسانوں کے لئے بہترین نظامِ سیاست و حکومت سمجھے۔—

"عوام کی حکومت، عوام کے مفاد کی خاطر، عوام ہی کی وساطت سے" — اور اسے انہوں نے جمہوریت کا نام دیا اور کہا یہ کہ اس نظام میں کوئی کسی پر حکومت نہیں کریگا بلکہ عوام اپنی رائے سے حکومت قائم کریں گے اور عوام کا منشا انکے نمائندوں کے ذریعے معلوم کیا جائے گا جنہیں وہ اس منصب کے لئے چنیں گے — جس چیز کو ان نمائندوں کی اکثریت درست کہے گی اسے درست سمجھا جائے گا اور اسے قانون کا درجہ حاصل ہوگا۔ اس قانون کو انہیں بھی ماننا ہوگا جو اقلیت میں ہوں۔ اس طرح سے یہ کہا گیا کہ اس طرزِ حکومت میں اقتدارِ اعلیٰ عوام کو حاصل ہوگا، وہ خود اپنے نمائندوں کے ذریعے اپنے اوپر حکومت کریں گے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے چونکہ ہم پر انگریز حکمران تھے اور جمہوریتوں میں جمہوریت انگریز کی جمہوریت تھی۔ ایک مثالی جمہوریت، جہاں جنگ جیتنے والے وزیرِ اعظم کو جو مملکت کا نجات دہندہ تھا بڑی آسانی سے ووٹ کی ٹھوکر مار کر ایوانِ اقتدار سے باہر کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے ہمارے ذہنوں میں یہی تھا کہ یہ بہترین طرزِ حکومت ہے — جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا!

اور اسی لئے ہم نے قیامِ پاکستان کے بعد انگریز کی اسی پارلیمانی جمہوریت کو اپنایا مگر ہمارے ہاں جمہوریت کی پہلی کمزوری جلد ہی اُبھر کر سامنے آ گئی، اپنے مفاد کی خاطر ہمارے نمائندوں نے وابستگیاں تبدیل کرنے میں کوئی عار نہ سمجھی۔ اور اکثریتیں اقلیتوں میں، اقلیتیں شب باشب اکثریتوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ جو آج خوب تھا وہ کل ناخوب ہو گیا اور روز روز کی حکومتوں کی تبدیلی کے باعث یہ جمہوریت ایک مذاق بن گئی — آخر کار ایک فوجی نے آگے بڑھ کر عنانِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اور اس نے اور اس کے حواریوں، خوشامدیوں نے اسے انقلاب کا نام دیا۔ اس نے قوم کو ایک نیا آئین اور ایک نیا طرزِ حکومت دیا جسے بنیادی جمہوریت کہا گیا جس میں بالواسطہ طریقۂ انتخاب رائج کیا گیا۔ اور اس طریقے کو اس نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے استعمال کیا اور اختیارات پر اپنی گرفت کو مضبوط مرکز کا نام دیا۔ جن لوگوں نے اس نظام کو اپنے آقا کی خوشنودی کے لئے استعمال کیا، ان کی زیادتیوں اور ان سے چشم پوشی کی وجہ سے عوام میں بے اطمینانی کی رو آئی اور ایک بار ساری قوم اس کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ہر کونے، ہر گوشے سے آواز اٹھی جمہوریت۔ پارلیمانی جمہوریت، ہر پارٹی، ہر گروہ پکار اٹھا۔ جمہوریت، پارلیمان۔ اور جو اپنے آپ کو اسلام کے ٹھیکیدار کہتے تھے، وہ بھی کہنے لگے پاکستان کی بقا اسلام اور جمہوریت پر ہے۔ جمہوریت عین اسلام ہے۔

جمہوریت کا لفظ اس حد تک دہرایا گیا کہ ہم سمجھنے لگے جیسے سارے دکھوں کا مداوا صرف اسی اسمِ اعظم میں پوشیدہ ہے — اور ایک اور فوجی نے پارلیمانی جمہوریت کا تجربہ دہرانے کا فیصلہ کر لیا کہ قوم کی یہی رائے تھی جمہوریت کے اصول کے مطابق ایک آدمی ایک ووٹ، جمہوریت کے اصول کے مطابق کامل آزادیٔ رائے اور جمہوریت کے تصورِ قومیت کے مطابق، نسلی، لسانی اور جغرافیائی بنیاد پر ملت کی تقسیم۔ اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ہم سب بھگت رہے ہیں۔ اس حد تک کہ آج پاکستان کا وجود تک خطرے میں نظر آتا ہے اور ہر سوچنے والا ذہن سوچ رہا ہے کہ ہم سے کہاں

لہ اس میں سب سے زیادہ ہاتھ ان کا تھا جو اپنے آپ کو محروم المفادات سمجھتے تھے۔ (طلوعِ اسلام)

غلطی ہوتی ہے کہ یہ سب خلفشار ہمارا مقدر بن رہا ہے۔

سب کے دعاوی یہی تھے کہ جمہوریت بہترین طرزِ حکومت ہے؛ پاکستان کی بقا جمہوریت اور اسلام پر منحصر ہے کیونکہ پاکستان کا قیام ہی اسلام اور جمہوریت کے نام پر عمل میں آیا تھا۔ عوام کی حاکمیت میں ہماری نجات کا راز مضمر ہے۔ اب ہم پر کوئی ڈکٹیٹر، کوئی آمر مسلط نہیں ہو سکتا؛ قوم بیدار ہو چکی ہے اور اپنے حقوق حاصل کر کے رہے گی ——۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کوئی بھی جمہوریت ہمارے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکی؛ اگر کوئی ایوب خان بنیادی جمہوریت کے نظام کو اپنے اقتدار کے دوام کے لئے استعمال کر سکتا ہے تو پارلیمانی جمہوریت کے نام پر کوئی مجیب الرحمٰن بلا شرکتِ غیرے کروڑوں کی تقدیر کی لگام اپنے ہاتھوں میں تھام سکتا ہے؛ ایک جمہوریت کے لئے انسانوں کو خریدا جا سکتا ہے تو دوسری جمہوریت کے لئے بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے جا سکتے ہیں —— یہ کیا طرزِ حکومت ہے جس میں انسان، منافقوں کے ہاتھوں دستِ قاتل میں سونپے جا سکتے ہیں۔ کوئی چنگیز، کوئی ہلاکو تو مفتوح قوم کے انسانوں کی کھوپڑیوں سے مینار کھڑے کرتا ہے۔ مگر مجیب تو اپنی ہی قوم کے لوگوں کی لاش سے ابھرتے ہوئے اہرام دیکھ کر مسکراتا اور زیرِ لب گنگناتا ہے۔ فتح ہماری ہوگی۔

دوسری چیز جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلسل چوبیس سال سے چیختے چلاتے رہے ہیں کہ اسلام ہمارے درمیان وہ اٹوٹ رشتہ ہے جس نے ہمیں ایک جان بنا رکھا ہے۔ مشرق و مغرب ہمارے لئے کوئی وجہ اختلاف نہیں۔ ہمارا رب، رب المشرقین والمغربین ہے۔ ہم نے اسلام کے نام پر یہ ملک حاصل کیا تھا اور اس میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں نے مل کر شانہ بشانہ کھڑے ہو کر جد و جہد کی تھی —— مگر ربع صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ ہم نے دیکھا کہ بنگالی مسلمانوں نے (ہماری اصطلاح میں انصار نے) بہاریوں یعنی مہاجروں کا بے دریغ خون بہایا۔ اسلام کے نام لیواؤں نے اپنے ساتھیوں کے خون سے ہاتھ رنگے جن کے ساتھ کل تک مسجدوں میں ایک ہی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی؛ اس اسلام کے نام لیواؤں نے جن کو کفار سے جنگ پر بھیجنے سے پہلے ان کے خلیفہ نے کہا تھا کہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھانا، پھلدار درخت کو نہ کاٹنا، سبز درخت کو نہ اجاڑنا (کہ زندگی کی نشانی ہے) سبز شاخوں کو تعصب و انتقام کی آگ میں جلا ڈالا۔ پھولوں کو ٹہنیوں سے ہاتھوں سے چھین کر لہو میں نہلا دیا۔ ہمارے "اسلام" نے کہیں ان کا ہاتھ نہیں پکڑا؛ ان کے دلوں کو ان ناپاک ارادوں سے باز نہیں رکھا۔

کیا اس رشتے کی گرفت کمزور پڑ چکی تھی یا ہمارا یہ مفروضہ ہی غلط تھا کہ جغرافیے کی دوری کے باوجود ہمیں یہ رشتہ ایک رکھ سکتا ہے جیسا کہ ابو الکلام نے کہا تھا —— "یہ کہنا سب سے بڑا فریب ہے کہ وہ علاقے جو جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں انہیں مذہب کا رشتہ متحد رکھ سکتا ہے" —— تو آپ نے دیکھ لیا کہ ہمارے دکھوں کا مداوا نہ جمہوری نظام کر سکا اور نہ ہی مروجہ مذہب کا رشتہ دستِ قاتل کو روک سکا۔

یہ حقیقتیں ہیں جو ہمارے لئے ایک چیلنج ہیں۔ ان سے ہم آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ہمیں ان کا جائزہ لینا ہوگا۔ اگر اب بھی ہم نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں تو ہمارے بہادر جوانوں کی قربانیاں بھی ہمیں زیادہ سے زیادہ وقتی طور پر محفوظ کر سکیں گی۔ اور مستقبل کا کوئی اور دن، ہمارے سامنے کسی اور مجیب کو لے آئے گا۔ ہم جعفران اپنی زبان سے الحذر اور الاماں تو پکار اٹھتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ اللہ کے نشتر ہیں۔

پہلے جمہوریت پر غور کیجئے۔ بنیادی جمہوریت کا جو ڈھونگ ہمارے سامنے رچایا گیا وہ اتنا ناپختہ اور ناتراش تھا

کہ اس سے تعمیری نتائج کی توقع ہی فضول تھی۔ کوئی سائنس دان کبھی اس طرح سے تجربہ نہیں کرتا کہ اسے تجربے میں کام آنے والے بنیادی کیمیاوی مادوں کے خالص ہونے پر یقین نہ ہو۔ سائنس کے چھوٹے سے چھوٹے تجربے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کے اجزاء کے اصلی ہونے کے متعلق یقین ہو جائے۔ مگر ہم نے یہ تک نہ دیکھا کہ اس طرح سے منتخب ہونے والے بنیادی ممبر ذہنی، تعلیمی اور کردار کے لحاظ سے کس قسم کے ہیں۔ اور وہ مثل تو آپ نے سن ہی رکھی ہوگی کہ جیسا دودھ ہوگا ویسی ہی اس پر بالائی آئے گی۔

رہی پارلیمانی جمہوریت۔ سو دھونس، دھاندلی، ترغیب و تحریص کی کھلی چھٹی کے ساتھ (کہ پراپیگنڈہ کہتے ہی اسے ہیں) پارلیمانی جمہوریت میں جو نمائندے اوپر آتے ہیں کیا وہ درحقیقت عوام کے نمائندے ہوتے ہیں؟ خدا لگتی کہیئے! کوئی جاگیردار دہقانوں کا نمائندہ ہو سکتا ہے؟ کوئی صنعتکار مزدوروں کا نمائندہ کہلا سکتا ہے؟ گھر بیٹھ کر دوسروں کی کمائی کھانے والا، محنت کشوں کی نمائندگی کر سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو بھیڑیئے بھی بھیڑوں کے نمائندے ہو سکتے ہیں (کہ کسی بھیڑ کو بھیڑیئے کے خلاف ووٹ ڈالنے کی ہمت نہیں ہو سکتی) ایسے میں جو حال بھیڑوں کا ہوگا وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔

جب تک یہ طبقاتی نظام ہے اور ووٹ ترغیب و تحریص سے، دھونس دھاندلی سے خریدے جا سکتے ہیں۔ جمہوری نظام نہیں چل سکتا، صحیح نمائندے اوپر نہیں آ سکتے۔ اس کے لئے ـــ ایک آواز اٹھی تھی ـــ کہ آمدنی کے لحاظ سے انتخابی حلقے بنائے جائیں اور اس طرح سے جو نمائندگی ہوگی وہ صحیح نمائندگی ہوگی۔ اور اس طرزِ انتخاب پر چنی گئی اسمبلی آبادی کی صحیح نمائندہ اسمبلی ہوگی ـــ بجا! مگر درجہ بدرجہ آمدنی والے لوگوں کے نمائندوں پر مشتمل اسمبلی کیا مختلف مفادات کے ٹکراؤ کا اکھاڑہ اور نتیجۃً خلفشار کا موجب نہ ہوگی؟ کیا وہ جذباتی فیصلوں، یا اسمبلی کے اندر مفادات کے سمجھوتوں کے نتیجے میں، ہر قائم شدہ ادارے کے اکھاڑ پچھاڑ پر منتج نہ ہوگی اور معاشرے کا رہا سہا نظام بھی درہم برہم نہ ہو جائے گا؟

سب سے زیادہ حیرت تو ان لوگوں پر تھی جو اسے عین اسلام بتا رہے تھے۔ یہ لوگ اپنی روایتی وضع قطع اور اپنی خود ساختہ دینی حیثیت سے عالم دین مانے جاتے ہیں اور اس طرزِ حکومت کو جو اپنی تاریخ، روایت اور مزاج اور اصل کے اعتبار سے غیر دینی (سیکولر) اندازِ حکومت ہے، عین دین قرار دیتے ہیں!!

جمہوریت میں فیصلہ انسانوں کی کثرت رائے سے ہوتا ہے اور اس فیصلے کی پابندی لازمی ہوتی ہے اور خدا کی کتاب کہتی ہے ـــ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللَّهِ ۔ (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق نہیں، خواہ اسے کتاب، اور حکومت، اور نبوت بھی کیوں نہ مل گئی ہو کہ وہ دوسروں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔

اور اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیت بقول بانیٔ پاکستان، بابائے قوم حضرت قائدِ اعظمؒ یہ ہے کہ:

> "اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری پابندی اور

آزادی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔"

اور قرآنِ حکیم کا ارشاد آپ کے سامنے ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل ہی نہیں کہ دوسروں سے اپنے احکام منوا سکے۔

جمہوریت کے داعی قرآن پاک ہی کی ایک آیت کو دلیل بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھ لیجئے اسلام میں جمہوریت ہے ـــــ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ـ "وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں۔"

یقیناً قرآن پاک کا یہ اعلان ایک انقلابی اعلان ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے جب ہر طرف شخصی استبداد کا دور دورہ تھا، چاہے وہ شہنشاہیت کے روپ میں ہو یا کلیسائیت کے رنگ میں۔ رعایا شہنشاہ یا کلیسا کے خلاف سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون اور واجب التعظیم ہوتا تھا۔ یہ اعلان کہ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ زلزلہ بپا کرنے والا اعلان تھا۔ مگر یہ حاملان شرع قرآن پاک کی یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ کسی انسان کو یہ حق ہی حاصل نہیں کہ دوسروں پر حکومت کر سکے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ـــــ

یہاں تک تو انسانی فکر خود پہنچ چکی ہے جیسا کہ (MAZZINI) کے قول سے ثابت ہوتا ہے کہ "ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسانوں کے۔ خواہ ایک انسان ہو (ملوکیت) یا زیادہ (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسان کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی ایسی چیز رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو تو ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ اگر خدا بیچ میں نہ ہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔"

"خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں یا انقلاب" میں اس میں ایک اور لفظ کا اضافہ کروں گا ـــ کہ خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں، یا انقلاب یا مروجہ اسلام ـــ اور یہ اس لئے کہ جس اسلام کی ہمیں تعلیم دی جاتی ہے وہ تمام تر ملوکیت، سرمایہ داری، جاگیرداری، سلطنت نبیؐ پر قائم مسلمانوں کی حکومتوں کا اسلام ہے!

ہمارے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہوئی کہ ہم نے یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا۔ ہم نے اپنی قومیت کی بنیاد اسلام کو قرار دیا۔ ہمارا نعرہ تھا "پاکستان کا مطلب کیا ـــ لا الٰہ الا اللہ" ـــ یوں ہم نے ہر دوسرے حاکم سے منہ موڑنے، ہر دوسرے قانون سے انکار کا نعرہ لگایا اور صرف خدا کے حکم پر چلنے کا اقرار کیا تھا ـــ

ایک انقلابی نعرہ لگانے کے بعد ہم پھر روایتی مسلمان بن گئے۔ نسلی، علاقائی اور لسانی تعصبات میں بٹے ہوئے مختلف قومیتوں کے نام لیوا ـــ کوئی پنجابی، کوئی سندھی، کوئی بلوچی، کوئی پٹھان اور کوئی بنگالی! اور پھر ان لوگوں کو "وطن" کے پرانے کلچر، پرانی روایات پر فخر کرنا سکھلایا۔ ہر موقع پر اپنے تمدن کی قدامت پر زور دیا گیا۔ آج بھی ہمارے کلچر کے ڈانڈے موہنجوداڑو اور گندھارا سے ملائے جاتے ہیں حالانکہ ایک انقلابی اعلان پر دستخط کرنے کا مطلب ہی پرانی روایات سے بغاوت اور نئے فلسفے سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

میں موہنجوداڑو سے وابستگی کو اپنے لئے قابلِ فخر نہیں سمجھتا۔ نہ ہی مجھے گندھارا تہذیب کو سینے سے لگانے اور

اسے اپنا کہنے میں کوئی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ان چیزوں کی محض ایک ہسٹاریکل اہمیت ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسلام لانے کے بعد یزدگرد اور اس سے پہلے کے شہنشاہوں سے عقیدت علاقائی نیشنلزم تو ہو سکتا ہے وہ انقلابی پیغام نہیں جسے اسلام کہتے ہیں ـــــ آج سارا عالم اسلام اس نیشنلزم کی لعنت میں گرفتار ہے۔ کوئی اڑھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا جشن مناتا ہے، کوئی آج بھی اہرام کو اپنی تہذیب کی علامت بناتا ہے۔

یہ سعادت صرف اس برصغیر کے مسلمانوں اور قائد اعظم کی حقیقی انقلابی شخصیت کے حصے میں آئی تھی کہ انہوں نے اجنتا، ایلورا، موہنجوداڑو اور گندھارا کے بدھوں سے لاتعلقی کا اعلان کر کے اسلام کو اپنی قومیت کا مدار قرار دیا۔ اسی اساس پر اپنی جنگ لڑی اور جیتی ـــــ اسلام کو عرب ملوکیت کی چھاپ سے آزاد کرا کے ایک زندہ و پائندہ حقیقت ثابت کرنے کا بیڑا اٹھایا ـــــ

مگر افسوس کہ ان کے انتقال کے بعد کسی کے بھی ذہن میں پاکستان کی سیاست، پاکستان کی معیشت، معاشرت کا کوئی واضح تصور نہ تھا جن لوگوں نے ٹی۔ وی کا (REMINISCIENCE) کا سلسلہ دیکھا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ راجہ صاحب محمود آباد، خان قیوم، شاہ عزیز الرحمٰن، میاں ممتاز محمد دولتانہ۔ کسی نے بھی اس سوال کا مثبت جواب نہیں دیا تھا کہ ان کے ذہن میں پاکستان کے دستور سیاست اور معیشت کا کیا نقشہ تھا۔ جو انٹرویو نشر نہ ہو سکا اس کے متعلق باتیں خوش آئند ہی شنید ہے!

قائد اعظمؒ کے بعد جو حضرات نظم و نسق کے ذمہ دار بنے انہوں نے نہ اس ملک کی معیشت اس رنگ میں ڈھالی، نہ معاشرت، نہ دستور ایسا دیا اور نہ ہی کوئی اور پالیسی ایسی بنائی جو قائد کے تصور کے مطابق ہو اور یوں آہستہ آہستہ پاکستان پنجابیوں، سندھیوں، پٹھانوں، بلوچوں اور بنگالیوں کا ملک بن گیا۔ بلکہ فیض احمد فیض اور دوسرے روسی حاشیہ برداروں کے مطابق پاکستان مختلف قومیتوں کا وطن ہے، ایسا ملک جس میں مختلف قومیں آباد ہیں جن کی اپنی اپنی علیحدہ علیحدہ زبان اور کلچر ہے ـــــ نتیجہ اس ذہنیت اور اس پراپیگنڈے کا یہ ہے کہ ہم اپنے اصل موقف سے کہ ہم مسلمانانِ برصغیر بحیثیت مسلمان کے ایک الگ اور مستقل قوم ہیں، یکسر ہٹ چکے ہیں۔ آج ہر کوئی اپنے اپنے مفاد کی بات کرتا ہے۔ کوئی پنجاب کی، کوئی سندھ کی، کوئی بنگال کی ـــــ اس سارے شور میں ایک آواز یہ کہنے کے لئے اٹھی تھی کہ کوئی پاکستان کے مفاد کی بات بھی تو کرو!

ہمارے ارباب اقتدار نے اس کا حل ایک انتظامی قدم اٹھا کر کرنا چاہا اور ون یونٹ بنا دیا۔ مگر یہ محض ایک انتظامی فیصلہ تھا جس کے پیچھے کوئی عمومی تحریک نہیں تھی، کوئی تنظیمی اقدام نہیں تھے، کوئی مثبت پروگرام نہ تھا۔ اور اس صورت میں یونٹ کے ہر مسئلے پر صوبوں کے حصوں (QUOTAS) کی بات ہوتی تھی۔ صوبوں کا نام ضرور اڑ گیا تھا۔ مگر ان کے مفادات باقی تھے اور اصل جھگڑا تو ہوتا ہی مفادات کا ہے۔ اب اگر صوبوں کے اختیارات اور مرکز کے اختیارات کا تناسب خلفشار کا موجب بنتا ہے تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ محدود علاقائی مفادات کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے، وحدت فکر و نظر کی غیر موجودگی میں اور امید ہی کیا ہو سکتی ہے۔ ورنہ صوبے اور مرکز دو مختلف مفادات کا نام نہ ہوتے۔ ایک ہی ملک ہے۔ اس کے کسی حصے کے مفادات مرکز سے کیسے متصادم ہو سکتے ہیں اور مرکز کو بھوکا ننگا کر کے صوبے کیسے آگے بڑھ سکتے ہیں؟ یہ مفاد پرستوں ہی کا کام ہے اور اس کی وجہ وہ سرمایہ دارانہ نظام ہے جس میں بڑے بڑے

لوگوں کے مفاد کام کرتے ہیں۔ بلوچستان اور سوات کی کانیں، سوئی کی گیس، سندھ اور پنجاب کی گندم، مشرقی پاکستان کی پٹ سن اور چائے۔ اگر انہیں ان اجارہ داروں کی اجارہ داریوں سے آزاد کرا کر قوم کی ملکیت قرار دے دی جائیں تو فرنٹیر کے خان، بلوچستان کے سردار، سندھ کے وڈیرے اور پنجاب کے جاگیردار بغیر ڈنک کے بچھو رہ جائیں گے اور پھر کوئی سندھ، پنجاب، بلوچستان اور فرنٹیر کے مفادات کی بات نہ کرے گا۔ سارے ملک کی دولت ساری قوم کی دولت قرار پائے گی اور جھگڑوں کی بنیاد اختیارات کی بندربانٹ ختم ہو جائے گی۔ اصل جھگڑا صوبوں کا نہیں سرمایہ دار اجارہ داروں کے مفادات کا ہے۔

اور غور کیا جائے تو یہی مفادات کا تصادم مذہب کے باوجود ہمیں ایک رشتہ میں نہیں پرو سکا۔ اگر مذہب کا محض نام قوموں کو ایک کر سکتا یا چند رسوم و عبادات لوگوں کے دلوں کو جوڑ سکتیں تو پھر افغانستان اور پاکستان، پاکستان اور ایران، ایران اور عراق کی حدیں حد فاصل کیوں قرار پاتیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر چھوٹے چھوٹے آبادی کے ٹکڑوں، اردن، لبنان، شیخوں کی ریاستوں کی کیا وجہ جواز باقی رہتی — یورپ کے ملک عیسائیت کے رشتے میں بندھے ہونے کے باوجود مختلف ملکوں میں کیوں بٹے ہوئے ہیں اور ان میں باہمی خونریز جنگیں کیوں ہوتی رہی ہیں۔

ہم نے قرآن کے دیئے ہوئے معاشی نظام کی طرف توجہ نہیں دی جو مفادات کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور توجہ دیتے بھی کیسے؟ نظم و نسق تو انہی کے ہاتھ میں رہا، سیاست تو آج تک انہی کے گھر کی لونڈی رہی جو مفادات کے اجارہ دار سرمایہ دار ہیں یا اس میں وہ آگے آتے رہے جو اسلام میں لونڈیوں کو گھر میں ڈال رکھنا جائز قرار دیتے رہتے ہیں۔ انہوں نے سیاست کی اس لونڈی کو بھی ان جاگیرداروں کے لئے جائز قرار دے دیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جب ان لوگوں کا جی کسی سے بھر جائے گا تو وہ اس لونڈی کو اونے پونے ان کے حوالے کر دیگا۔

یہ دولتانے، یہ شوکت حیات، یہ کھوڑو، یہ ہارون، یہ قیوم خان اور اس قماش کے دوسرے لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ "لونڈی" ہاتھ سے نکلی جاتی ہے تو انہوں نے کسی مودودی کی مدد چاہی اور اس نے اسے دولت مشترکہ بنانے کا فارمولا سمجھا دیا —

یہ سرمایہ داروں کی سیاست اور سرمایہ داروں کا مذہب ہے جو ہم میں انتشار اور افتراق کا موجب ہے۔ ہم نے انقلابی نعرہ لگایا تھا۔ ہم نے غیر اللہ سے ہر وفاداری کا ناطہ توڑ کر صرف ایک خدا کے با اختیار کے دیئے قوانین کی پابندی کا عزم کیا تھا۔ ہمارے کرنے کا کام یہ تھا کہ ہم قرآن کے دیئے ہوئے قوانین کی حدود کے مطابق ایک انقلابی معاشرے کی تشکیل کرتے۔ پرانے لوگ اگر راہ پر نہ آ سکتے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے نئی نسل کی تربیت انہی خطوط پر کرتے کہ وہ مفاد پرستی کی بجائے خدا پرستی کی طرف مائل ہوتے۔ محنت کی قدر و قیمت، محنت کی اہمیت جانتے ہوئے (لیس للانسان الا ما سعیٰ) اپنی بھرپور توانائیاں اس کے پروگرام کی تکمیل میں لگا دیتے اور قل العفو کے مطابق اپنی معمولی ضروریات کے علاوہ سب کا سب خدا کی راہ، اس کے بندوں کی بہتری کے لئے وقف کر دیتے۔

جب وہ نئی نسل آگے بڑھتی جو دل کی گہرائیوں سے یہ جانتی کہ یہاں اصل حکمرانی خدا کے قوانین کی ہے اور وہ زندگی کے ہر موڑ پر اپنے ہر مسئلے کے حل کرنے کے لئے خدا کی کتاب کی طرف رہنمائی کے لئے دیکھتے کیونکہ کسی بھی انسان کو یہ

حق ہی حاصل نہیں کہ وہ اپنا قانون کسی سے منوا سکے۔ جب کروڑوں نگاہیں ایک ہی سمت اٹھتیں تو دنیا اس حقیقت کی عملی تفسیر اپنے سامنے دیکھ لیتی کہ

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

اور وہاں سے جو رہنمائی ملتی وہ کسی انسان کے مفاد کی پابند نہ ہوتی بلکہ انسانیت کے مفاد کی نگران ہوتی۔ وگرنہ یہاں اقتدار چاہے ایک شخص کے ہاتھ میں ہو یا ایک جماعت کے ہاتھ میں، یہ جماعت امراء کی جماعت ہو یا مزدوروں کی، نتیجہ ایک ہی ہوگا — فساد فی الارض کیونکہ

طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ہر گروہ اپنے ہی مفاد کا نگران ہوتا ہے اور اس کی ساری کوششیں اسی نکتے کی طرف مرکوز ہوتی ہیں کہ کسی طرح اس کی اکثریت برقرار رہے۔ دھونس سے، دھاندلی سے، غیر اخلاقی طریقوں سے، کسی طرح بھی ہو۔ اس لئے کہ جمہوریت، بنیادی جمہوریت ہو، یا پارلیمانی جمہوریت یا پرولتاری جمہوریت۔ ان کے ہاں کوئی ایسی مستقل اقدار نہیں جو خوب و ناخوب، سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کر سکیں — وہاں فیصلہ صرف کثرتِ آراء سے ہوتا ہے۔

یہ مستقل اقدار انسان کو وحی خداوندی کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتیں اور مسلمان کی حیثیت سے یہ ہمارا ایمان ہے کہ وحی خداوندی اپنی اصلی، منزہ اور بغیر ملاوٹ کے سوائے قرآن کریم کے اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اس لئے ہمیں قائداعظم کے اس فرمان کے مطابق جسے میں پہلے درج کر چکا ہوں، اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے تھا اور نئی نسل کی تربیت انہی خطوط پر کرنی چاہیئے تھی۔

مگر ہم نے مسلسل ۲۴ سال اس طرف سے غفلت برتی اور نتیجہ اس کا ہمارے سامنے ہے۔ ہماری نئی نسل یورپ اور امریکہ سے امڈ کر دنیا میں پھیلتے ہوئے طوفانِ بدتمیزی کے گرداب میں پھنس چکی ہے۔ مذہب سے بیگانگی قدرتی تھی۔ اصل دین کو کسی نے انہیں سمجھایا نہیں۔ روایتی مذہب اس دورِ حاضر کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا اور سرمایہ دار معاشرے کے نظر فریب سراب ان تشنہ لبوں کو ایک (MAD RACE) پاگل دوڑ میں دوڑا رہے ہیں اور آج ہمارے سٹوڈنٹ لیڈر ہوائی جہازوں میں ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے اور کبھی کبھی بیرونِ ملک بھی اکتسابِ سیاست کرتے پھرتے ہیں اور پڑھنے لکھنے کی بجائے سڑکوں پر ٹریفک لائیٹیں توڑ کر سمجھتے ہیں کہ وہ انقلاب کو قریب تر لا رہے ہیں۔ وہ بیچارے مجبور ہیں۔ انہیں انقلاب اور فساد میں کسی نے فرق سمجھایا ہی نہیں۔

ہم نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔ شاید ہم تاریخ کی یہ دوڑ ہار چکے ہیں۔ وقت بڑا تیز رفتار ہے۔ مگر پھر بھی آخری کوشش سمجھ کر ہی سہی اب بھی اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔ ہمارے تعلیمی کمیشن کبھی اس طرف نہیں آئیں گے علم و دانش کے یہ درخشندہ ستارے "تو بیچارے — یہ خود فراخیِ افلاک میں ہیں خوار و زبوں

انہیں تو اپنے علم کا سارا نشہ میخانۂ افرنگ کی مانگی ہوئی صہبا کا ہے۔

طلوعِ اسلام کالج اس طرف ایک جرأتمندانہ قدم ہے۔ یہ سکیم مدت سے چل رہی ہے مگر رفتار بڑی سست ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سکیم کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔ اس کے لئے آپ ہی لوگوں کو آگے بڑھ کر ہاتھ بٹانا ہے۔ مفادات کے نگران سرمایہ دار تو اس طرف آنے سے رہے۔ والسلام

حقائق و عبر

۱۔ آہ بیچاری اسلامی حکومت!

مودودی صاحب نے پاکستان کے مجوزہ آئین کے سلسلہ میں چند ایک اصولی نکات پیش کئے ہیں۔ ان میں ایک نکتہ یہ ہے :-

> جس حکومت کے دستور میں رسولِ خدا کے حکم کو آخری فیصلہ کن سند نہ تسلیم کیا گیا ہو، وہ ایک اسلامی حکومت نہیں ہے۔ (ایشیا۔ ۳۰ رجنوری ۱۹۷۲ء)

رسول اللہ کے احکام کے متعلق، اہلِ حدیث حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ:

> جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف ۔۔۔۔ بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے ۔۔۔۔۔
> ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث، از مولانا اسمٰعیل مرحوم)

لیکن مودودی صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ :

> یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)

کیا مودودی صاحب فرمائیے کہ اگر حکومت نے کسی ایسی حدیث کو اپنے فیصلے کی آخری سند قرار دے لیا جسے آپ صحیح تسلیم نہ کرتے ہوں، تو آپ اس حکومت کو اسلامی قرار دینگے یا نہیں!

اور مودودی صاحب یقیناً اس سے بھی بےخبر نہیں ہونگے کہ حنفی حضرات بخاری اور مسلم کی قریب دو سو احادیث کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ فرمائیے! ان دونوں فرقوں (اہلِ حدیث اور حنفی حضرات) کے معیار کے مطابق کونسی حکومت اسلامی قرار پاسکے گی! اور ابھی ہم نے دوسرے فرقوں کا ذکر نہیں کیا جن کے احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔

(۰)

۲۔ یہ کونسے قرآن کی آیت ہے؟

مودودی صاحب کے پیش فرمودہ انہی نکات میں ایک نکتہ یہ ہے :-

> اسلامی حکومت کا پانچواں بنیادی اصول یہ ہے کہ اس میں تمام اجتماعی امور مشورہ سے انجام پاتے ہیں اسلامی اجتماعی زندگی کے اس اصول کو قرآن پاک ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :-

"جس نے اپنے کسی بھائی کو ایسی بات کا مشورہ دیا ہو جس کے متعلق وہ خود جانتا ہو کہ صحیح بات

دوسری ہے کو اس نے در اصل اس کے ساتھ خیانت کی" (ایشیا - صفحہ ۳۰)

کیا مودودی صاحب بتائیں گے کہ یہ الفاظ کونسے قرآن پاک میں ہیں؟ کیونکہ جو قرآن پاک اس وقت امت کے پاس ہے اس میں تو یہ الفاظ کہیں نہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ حضرت اب خدا کی کتاب کے ساتھ بھی کیا کھیل کھیل رہے ہیں!

(۰)

۳۔ پاکستانی تہذیب

روزنامہ مساوات کی ۴ جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت کے ایک زیر ادارہ میں موہنجوڈارو کے آثار قدیمہ کے سلسلہ میں لکھا ہے:-

محققین کا کہنا ہے کہ مزید کھدائی سے پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب کے مزید آثار ملیں گے لیکن اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی کہ سابقہ حکومتوں کو صرف اپنی کرسیوں سے دلچسپی تھی اور پاکستانی تہذیب ان کے لئے بے معنی شے ہے۔

کیا ہم مدیر مساوات سے دریافت کرسکتے ہیں کہ موہنجوڈارو سے پانچ ہزار سال پہلے کے جو آثار ملیں گے انہیں "پاکستانی تہذیب" سے کیا واسطہ ہوگا؟ یہ محض اتفاق ہے کہ تقسیم ہند کے وقت رستوں کی جو لکیریں کھینچی گئیں ان کی رُو سے موہنجوڈارو یا ہڑپہ وغیرہ مملکت پاکستان کی حدود کے اندر آگئے۔ اگر یہ لکیریں ذرا آگے بڑھ آتیں تو یہ مقامات ہندوستان کا حصہ ہوتے۔ اور اگر آپ کا معیار یہ ہے کہ جو کچھ پاکستانی علاقہ کے اندر آگیا ہے وہ پاکستانی تہذیب کا مظہر ہے تو پھر ہندوؤں کے مندر، بدھوں کے اسٹوپے، سکھوں کے گوردوارے، جو پاکستانی حدود کے اندر آگئے ہیں سب پاکستانی تہذیب کے مظاہر قرار پاجائیں گے!

آپ نے دیکھا کہ جب انسان کا پاؤں اپنے مرکز سے اکھڑ جائے تو پھر اس کی زندگی کا دائرہ کس طرح ٹیڑھا بیڑھا ہو جاتا ہے! حضرت! پاکستانی تہذیب کے ڈانڈے ملانے ہیں تو بدر وحنین کے ریگزاروں سے ملائیے۔ موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے کھنڈروں سے نہیں۔

(۰)

۴۔ اب فرمائیے! کیا ارشاد ہے

(سابق صدر) ایوب خان کے خلاف جماعت اسلامی نے جہاد کی جو مہم چلائی تھی اس میں (اس کے جرائم کی فہرست میں) یہ بھی درج کیا تھا کہ اس نے خاندانی منصوبہ بندی جیسے خلاف اسلام نظریہ اور عمل کو پاکستان میں رائج کیا ہے۔ اس جماعت نے خاندانی منصوبہ بندی کو جس شد و مد سے خلاف اسلام قرار دیا تھا اور اس پر جو ہنگامہ آرائیاں کی تھیں اہل پاکستان انہیں فراموش نہیں کرسکتے۔ اس کے بعد حسب ذیل خبر کو پڑھیے جو روزنامہ امروز (لاہور) کی یکم جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے:-

رباط ۳۱ دسمبر خاندانی منصوبہ بندی کی پہلی اسلامی کانفرنس نے قرار دیا ہے کہ اسلامی قانون میں تحریک کنٹرول

جائز ہے لیکن عورتوں کو بانجھ کر دینا اور استقرارِ حمل جائز نہیں۔ کانفرنس کے ایک اعلامیہ کے مطابق یہ پانچ روزہ کانفرنس بین الاقوامی خاندانی منصوبہ بندی فیڈریشن کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی تھی جس میں ۶۹ مندوبین شریک ہوئے جن میں ۲۳ مسلم ریاستوں کے تھے .... کانفرنس میں اسلام کے تمام فرقوں کی نمائندگی تھی جن میں علماء اور سائنسدان بھی شامل تھے۔

—— (۰) ——

۵۔ جو حربہ کام دے جائے

روزنامہ نوائے وقت کی ۱۵ فروری کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

"نام نہاد بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ عبدالصمد آزاد نے تمام اسلامی ممالک سے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینے کی پُرزور اپیل کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بنگلہ دیش دنیا بھر میں دوسرا سب سے بڑا مسلم ملک ہے اور اسے اسلامی ممالک سے یہ درخواست کرنے کا جائز حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کا وجود تسلیم کریں۔

"دنیا کا دوسرا سب سے بڑا مسلم ملک جسے اسلامی ممالک سے اپیل کا حق پہنچتا ہے"!

چانکیہ سیاست زندہ باد!

—— (۰) ——

۶۔ سوشلزم اور اخلاقی اصلاح

رائٹر کی وساطت سے یہ خبر عام ہوئی ہے کہ روس میں منظم طور پر موٹر کاریں چرانے کا سلسلہ دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے اور پولیس اس کی روک تھام کے لئے بے بس ہو گئی ہے۔ (نیوز ٹائمز۔ راولپنڈی۔ ۲۷/۲)

کیا ان حضرات نے اس خبر کو پڑھا ہے جو اٹھتے بیٹھتے یہ پرچار کرتے رہتے ہیں کہ سوشلسٹ نظام کے قیام سے جرائم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

جرائم کی روک تھام قلب و نگاہ کی تبدیلی سے ہوتی ہے نہ کہ کسی نظام کو میکانکی طور پر مسلط یا نافذ کر دینے سے۔ اور قلب و نگاہ کی تبدیلی کسی ایسے فلسفۂ حیات کی رو سے نہیں ہو سکتی جو مستقل اقدارِ حیات اور قانونِ مکافاتِ عمل کا قائل نہ ہو۔ سوشلزم کا یہی بنیادی سقم ہے جس کی وجہ سے وہ نظام میں تو تبدیلی کر دیتی ہے انسانوں میں نہیں۔ قرآن انسانوں کی تبدیلی سے نظام میں تبدیلی کرتا ہے۔

—— (۰) ——

۷۔ صدر بھٹو کی خدمت میں

روزنامہ نوائے وقت نے اپنی ۱۵ فروری کی اشاعت کے زیرِ اداریہ میں لکھا ہے۔

ایک اخبار کی اطلاع کے مطابق لاڑکانہ کو ایک مثالی شہر بنانے کے لئے ماسٹر پلان تیار کیا جا رہا ہے۔ اس پر کروڑوں روپے صرف ہوں گے۔ صدر بھٹو کی ہدایت پر اس ماسٹر پلان کی تیاری کے ضمن میں مختلف محکموں کے افسران

کا ایک خصوصی اجلاس ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ کی صدارت میں منعقد بھی ہو چکا ہے۔
خدا کرے کہ یہ خبر غلط ہو۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو ہم محترم صدر مملکت کی خدمت میں باادب لیکن بزور گزارش کریں گے کہ وہ اس منصوبہ کو فی الفور کالعدم قرار دیدیں۔ یہ بیچارا ملک اس قسم کی "عیاشیوں" کا متحمل کس طرح ہو سکتا ہے۔ ایسے منصوبوں سے یہ فلاکت زدہ ملک، بیفردں کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ دے گا۔ اور آپ بھید بدنام ہو جائیں گے۔

(۱۰)

۸۔ ملحد و بے دین قیادت

مودودی صاحب نے محرم الحرام کے سلسلہ میں بیان دیتے ہوئے فرمایا ہے۔

حضرت امام حسین رض کا اسوۂ مبارک اور آپ کی شہادت ہمیں یہ سبق دے رہی ہے کہ آمریت اور جبر و استبداد کے سامنے خاموشی سے سر اطاعت خم کر دینا ایک مسلمان کا کام نہیں۔ امام حسین رض کی محبت کا تقاضا، اور مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی استطاعت کی آخری حد تک ملحد اور بیدین قیادت کے خلاف مزاحمت کرے اور اس راہ میں اگر اپنی اور اپنے اعزہ و اقارب کی جان بھی قربان کرنی پڑے تو اس سے گریز نہ کرے۔

(نوائے وقت ۔ ۱۷/۲)

مودودی صاحب کیطرف سے "ملحد و بیدین قیادت" کے خلاف مزاحمت کا نعرہ قائد اعظم سے لے کر ایوب خان تک بلند ہوتا رہا اور "آمریت اور جبر و استبداد" کے جہاد کا پرچم بھی مسلسل لہراتا رہا۔ ایوب خان کے بعد، یہاں ایک قیادت (سابق جرنیل) یحییٰ خان کی آئی۔ اس قیادت کے متعلق کیا ارشاد ہوا اسے آپ طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اسے ہم بغرض تجدید یادداشت دوبارہ پیش کرتے ہیں۔ اس قیادت کے متعلق ارشاد ہوا تھا۔

مجھے قوی امید ہے کہ اسلامی نظام حکومت کا جو سلسلہ حضرت علی رض کی شہادت سے منقطع ہوا تھا اس کی بحالی کا آغاز انشاء اللہ حضرت علی رض ہی کے عاشقوں میں سے ایک شخص کے ہاتھوں پاکستان کی سرزمین سے ہوگا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ یحییٰ خان صاحب کو عزم و ہمت اور اس اخلاص کے ساتھ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام بحال کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس کا انہوں نے بار بار اپنی تقریروں میں ذکر فرمایا ہے۔

آمین!

(قائمقام امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد۔ بحوالہ ایشیا ۔ ۱۴/۱۲/۶۹)

یعنی تحریک پاکستان کے زمانے سے لے کر آج تک (جنرل) یحییٰ خان کی ایک قیادت ایسی تھی جس میں نہ آمریت تھی نہ استبداد، نہ الحاد تھا نہ بے دینی۔ وہ قیادت، اسلامی نظام کے منقطع سلسلہ کو از سر نو قائم کرنے کا ذریعہ اور حضرت علی رض کے عشق میں جذب ہو کر ان کے نقش قدم پر چلنے کا آئینہ تھی!! انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۱۱)

پرچہ نہ ملنے کی اطلاع

متعلقہ مہینے کی ۲۰ تاریخ تک دے دیجئے۔
اس کے بعد اطلاع ملنے پر، پرچہ (اگر موجود ہوا تو) قیمتاً بھیجا جائے گا۔
(ناظم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تعدد ازواج

سید یعقوب شاہ صاحب سابق آڈیٹر جنرل پاکستان

سورۃ نساء کی ابتداء میں حسب ذیل آیت موجود ہے:۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۔ (نساء/۳)

اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کر لو۔ دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے۔ پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر بس کر دیا جو لونڈی تمہارے ملک میں ہو وہی سہی۔

اس آیت کے نزول کا زمانہ سنہ ۳ھ بتایا جاتا ہے[1]۔ جیسا کہ آپ آگے چل کر دیکھیں گے یہی رائے مولانا مودودی صاحب کی ہے اور علماء کی کثرت کو اس سے اتفاق ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے سے تمام مسلمانوں کو چار سے زیادہ بیویاں کرنے کی ممانعت ہو گئی۔ یہاں تک کہ جن کے پاس چار سے زیادہ بیویاں تھیں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ چار سے جو زیادہ ہیں ان کو علیحدہ کر دو۔ مگر خود آپ نے چار سے زیادہ بیویاں رکھیں۔ بلکہ جیسا کہ مندرجہ ذیل جدول[2] سے ظاہر ہوتا ہے سنہ ۳ھ ہجری کے بعد آپ نے نئے نکاح بھی کئے۔

اسم گرامی	سن نکاح	منکوحہ کی عمر	حضورؐ کی عمر
حضرت خدیجہؓ	نبوت سے ۱۵ سال قبل	۴۰ سال	۲۵ سال
حضرت سودہؓ	سنہ ۱۰ نبوی	۵۰ "	۵۰ "
حضرت عائشہؓ	سنہ ۲ھ	۱۴ "	۵۴ "
حضرت حفصہؓ	سنہ ۳ھ	۲۲ "	۵۵ "
حضرت زینبؓ (ام المساکین)	سنہ ۳ھ	۳۰ "	۵۵ "

[1] سیرۃ النبی حصہ اول - جلد دوم بعنوان نکاح وطلاق - صفحہ ۱۲۶

[2] مسلمانوں کی مائیں۔ از رازی انیری - صفحہ ۲۲۰

حضرت اُمّ سلمہ رض	(سن نکاح) سنہ ۴ھ	(منکوحہ کی عمر) ۳۵ سال		(حضورؐ کی عمر) ۵۶ سال	
حضرت زینب رض بنت جحش	سنہ ۵ھ	″	۳۸	″	۵۷ ″
حضرت جویریہ رض	سنہ ۵ھ	″	۳۴	″	۵۷ ″
حضرت ام حبیبہ رض	سنہ ۶ھ	″	۳۶	″	۵۸ ″
حضرت صفیہ رض	سنہ ۷ھ	″	۱۷	″	۵۹ ″
حضرت میمونہ رض	سنہ ۷ھ	″	۵۱	″	۵۹ ″

بزرگانِ دین اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت شمار کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تحدیدِ ازواج کے عام حکم سے مستثنیٰ فرما دیا تھا۔ چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی "بیان القرآن" میں روح المعانی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں داخل ہے۔ لیکن اس قسم کا جواب غیر مسلم معترضین کی تشفی نہیں کرتا۔ اس سے ہمارے علما کو بھی انکار نہیں ہے۔ مثلاً مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں: "اس جواب کے بارے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ اس سے مقصود کفار و منافقین کو مطمئن کرنا نہیں تھا بلکہ ان مسلمانوں کو مطمئن کرنا تھا جنکے دلوں میں مخالفین اسلام وسوسے ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں چونکہ یقین تھا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں نازل ہوا ہے اس لئے قرآن کی محکم آیت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ نبی نے چار بیویوں کے عام قانون سے اپنے آپ کو خود مستثنیٰ نہیں کر لیا بلکہ یہ استثنا کا فیصلہ ہمارا کیا ہوا ہے[1]۔" لیکن اپنا تو ایمان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اس قدر پاک و جمیل ہے کہ دشمن سے دشمن بھی اس میں کوئی نقص نہیں نکال سکتا۔ لہٰذا مجھے ایک ایسے جواب کی تلاش ہے جو غیر مسلم معترضین کو بھی مطمئن کر سکے، اور یہ اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ تحدیدِ ازواج کے احکام کے نزول کے بعد حضورؐ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔ بالفاظِ دیگر آیت مذکورہ بالا ۷ھ سے پہلے نازل نہیں ہوئی۔ آئیے دیکھیں یہ کہاں تک درست ہے۔

(۲) سورۂ نساء کی تمہید میں مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں۔ "یہ سورہ متعدد خطبوں پر مشتمل ہے جو غالباً ۳ھ کے اواخر سے لے کر ۴ھ کے اواخر یا ۵ھ کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلہ تقریر میں نازل ہوئی تھیں اور ان کا ٹھیک زمانہ نزول کیا ہے لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہو جاتی ہیں اس لئے ان کی مدد سے ہم ان مختلف تقریروں کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں جن میں یہ احکام اور اشارے واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ وراثت کی تقسیم اور یتیموں کے حقوق کے متعلق ہدایات جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھیں جبکہ مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہو گئے تھے اور مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں اس حادثے کی وجہ سے بہت سے گھروں میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شہدا کی میراث کس طرح تقسیم کی جائے۔ اور جو یتیم بچے انہوں نے چھوڑے ہیں ان کے مفاد کا تحفظ کیسے ہو۔ اس بنا پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ابتدائی چار رکوع اور پانچویں رکوع کی پہلی تین آیتیں اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہونگی[2]۔" چونکہ آیت تحدیدِ ازواج پہلے رکوع میں شامل ہے اس لئے اس استدلال کے مطابق اس کا زمانہ نزول ۳ھ یا اس سے قبل ہونا چاہیئے۔ لیکن

[1] تفہیم القرآن۔ ج ۴۔ ص ۱۱۳، [2] تفہیم القرآن۔ ج ۱۔ ص ۳۱۹۔

احقر کی دانست میں اس قیاس کی بنیادیں بہت کمزور ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان پر ایک اہم فیصلہ کی عمارت کھڑی کی جا سکے خاص کر جبکہ اس فیصلہ سے حضورؐ کی ذات والاصفات پر حملہ کا ایک راستہ کھلتا ہو۔ سید قطب اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" (ص۵۵۲) میں سورۂ نساء کے نزول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کی بعض آیتیں سورۂ ممتحنہ کے بعد ۸ھ اور ۹ھ میں نازل ہوئی تھیں۔ اس سورت کی آیت ۵۸ (اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی شان نزول واقعہ مفتاح کعبہ ہے۔ یعنی فتح مکہ (۸ھ) کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عثمان بن ابی طلحہ کو خانہ کعبہ کی کنجی دینا۔ چوتھے رکوع کے نزول کو مولانا مودودی صاحب صراحۃً قریب جنگ اُحد کا واقعہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کی آیت ۲۴ (وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) واحدی کے مطابق غزوہ اوطاس کے وقت (۸ھ) نازل ہوئی تھی[۱]۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اس سورۃ کی بعض اور آیات بھی ۸ھ یا اس سے قریب زمانہ میں نازل ہوئی ہوں مثلاً یہی آیت زیر بحث جس نے مسلمانوں کے لئے بیک وقت چار بیویوں کی حد مقرر کر دی۔ اس سلسلہ میں دو باتیں ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ زمانہ نزول کا تعین ہونا نہایت دشوار امر ہے۔ ان چند آیات کے سوا جن کی شان نزول یقینی ہے۔ باقی کے متعلق صرف قیاس ہی سے کام لیا جا سکتا ہے اور اس سے یقین حاصل نہیں ہو سکتا۔ شراب کی ممانعت کے بارے میں سید سلیمان ندوی صاحب لکھتے ہیں کہ اس کے احکام نازل ہوئے تو "اسی وقت آنحضرت صلعم نے مدینہ کے گلی کوچوں میں منادی کرا دی کہ آج سے شراب حرام ہے۔ غور کرو شراب کی حرمت کس اعلان عام کے ساتھ عمل میں آئی۔ بایں ہمہ ابھی تک یہ متعین نہیں ہوا کہ یہ کس سال کا واقعہ ہے۔ محدثین وارباب روایت اس امر میں نہایت مختلف الآراء ہیں[۲]۔" دوم۔ سورتوں کو جو نزولی ترتیب دی گئی ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں شامل احکام بھی اسی ترتیب سے نازل ہوئے تھے۔ مثلاً حضرت ابن عباسؓ کے مطابق سورۂ احزاب سورۂ نساء سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ لیکن سورۂ نساء میں جنگ اُحد سے پیدا ہونے والے حالات کے متعلق احکام ملتے ہیں[۳] اور سورۂ احزاب میں غزوہ خندق کا ذکر ہے جو جنگ اُحد سے دو سال بعد پیش آیا۔ قرآن مجید میں اس قسم کی متعدد مثالیں ملتی ہیں جن میں آیات کو کہیں پہلے نازل شدہ سورتوں میں شامل کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ اوائل ایام مدینہ کی ہے مگر اس میں تحریم ربوٰ کی آیات بھی موجود ہیں جو ۹ھ میں نازل ہوئیں۔ اسی سورت کی آیت ۲۸۱ (وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر اور بعض کے مطابق اس سے بھی بعد نازل ہوئی تھی۔ سورۂ مائدہ کے نزول کا زمانہ آخر ۶ھ یا شروع ۷ھ تصور ہوتا ہے اور بیان کے تسلسل سے غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ پوری سورۃ ایک ہی خطبہ پر مشتمل ہے[۴]۔ لیکن اس کی آیت ۳ (حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ ...) حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی۔ لہٰذا آیت تحدید ازواج کا سورۂ نساء کے رکوع اول میں واقع ہونا اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ ۳ھ یا اس سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ بالکل ممکن ہے کہ وہ دو سال بعد نازل ہوئی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے سورۂ نساء کے شروع میں شامل کر دی گئی ہو چنانچہ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا کوئی ایسی قابل وثوق شہادت موجود ہے جو اس امکان کے متناقض ہے مثلاً اگر ۸ھ سے قبل کا کوئی ایسا واقعہ مل جائے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار سے زیادہ بیویاں رکھنے سے منع فرمایا ہو تو

۱؎ اسباب النزول۔ ص۱۰۸۔ ۲؎ سیرۃ النبی جلد دوم۔ ص۱۲۲ ۳؎ الاتقان سیوطی۔ جلد ۱۔ ص۱۱
۴؎ تفہیم القرآن۔ از مولانا مودودی صاحب۔ جلد ۱۔ ص۴۳۰

خاکسار کا پیش کردہ نظریہ یقیناً غلط ثابت ہو جائے گا۔

(۳) ہماری کتب احادیث میں تین صحابہؓ کے نام ملتے ہیں جن کو حضورؐ نے حکم دیا تھا کہ چار سے زاید جو بیویاں ہیں ان کو علیحدہ کر دو۔ ایک غیلان ثقفی جن کی دس بیویاں تھیں۔ دوسرے نوفل بن معاویہ جن کی پانچ بیویاں تھیں اور تیسرے حارث بن قیس (بعض انہیں قیس بن حارث کہتے ہیں) جن کی آٹھ بیویاں تھیں[۹]۔ غیلان ثقفی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ طائف کی لڑائی میں اسلام لائے[۱۰] اور نوفل بن معاویہ کا فتح مکہ کے وقت اسلام لانا مرقوم ہے[۱۱]۔ یعنی ان دونوں نے ۸ھ میں اسلام قبول کیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مندرجہ بالا حکم موصول کیا۔ سعی کثیر کے باوجود مجھے حارث بن قیس کے اسلام لانے کا وقت معلوم نہیں ہو سکا۔ گمان غالب یہی ہے کہ وہ بھی ان کا ہمعصر ہو گا۔ کم از کم خاکسار کو کوئی ایسی شہادت نہیں ملی جس کی بنا پر اسے ۸ھ سے پہلے کا واقعہ تصور کیا جا سکے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سورۂ نسآء کے احکام سے پہلے بیویوں کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہ تھی اور عرب میں کئی ایسے مرد تھے جن کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ اگر احکام تحدید دراصل ۳ھ میں نازل ہو چکے تھے تو یہ نہایت بعید از قیاس ہے کہ تین سال تک کوئی ایسا شخص اسلام نہیں لایا جسے حضورؐ کو یہ حکم دینا پڑتا کہ اپنی چار سے زائد بیویوں کو علیحدہ کر دو اور ۸ھ میں دفعتاً کئی ایسے واقعات پیش آ گئے۔ اغلب یہی ہے کہ یہ احکام ۷ھ کے اختتام پر نازل ہوئے اور تھوڑا عرصہ بعد یعنی ۸ھ میں ان کے نفاذ کے مواقع پیدا ہو گئے اور جب صحابہ کو حضورؐ کے حکم کا علم ہو گیا تو وہ خود ہی اس پر عمل کرنے لگ گئے۔ پس ان تاریخی واقعات اور احقر کے پیش کردہ نظریہ میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ وہ اس کی تائید کرتے ہی نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ آیت تحدید ازواج کی شانِ نزول کے بارے میں مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں:- "جنگ احد کے بعد جو بہت سی عورتیں کئی کئی بچوں کے ساتھ بیوہ رہ گئی تھیں یہ ان کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی۔ اس میں مسلمانوں کو اس امر کی توجہ دلائی گئی تھی کہ اگر شہدائے احد کے یتیم بچوں کے ساتھ تم یوں انصاف نہیں کر سکتے تو تمہارے لئے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کا دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا ہے۔ ان کی بیوہ عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان کے ساتھ نکاح کر لو تاکہ انکے بچے تمہارے بچے بن جائیں اور تمہیں ان کے مفاد سے ذاتی دلچسپی ہو جائے"[۱۲]۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مدینہ میں منافقوں اور یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ان عورتوں کو تحفظ مہیا کرنے کی خاص ضرورت تھی۔ خواتین کے معاملے میں یہودی خاص کر شرارت پر مائل تھے۔ مسلم خواتین کے متعلق فحش اشعار کہتے اور سڑکوں پر گاتے تھے۔ انہیں کی چھیڑ خانی کا ایک واقعہ غزوہ قینقاع پر منتج ہوا تھا۔ لہٰذا بیوہ عورتوں کو خاوند کا تحفظ مہیا کرنا یتیموں اور بیواؤں دونوں کی خاطر ضروری تھا۔ احد کی جنگ سے اس ضرورت کو اور اہمیت حاصل ہو گئی تھی کیونکہ بیواؤں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو گیا تھا۔ عیاناً تعداد ازواج پر قید لگانے کا یہ موقع نہ تھا۔ اس کے لئے فتح خیبر کے بعد کا زمانہ زیادہ موزوں نظر آتا ہے جب یہودیوں کی طاقت ٹوٹ گئی تھی چنانچہ احکام تحدید ازواج کو ۸ھ سے ملحق کرنا محلِ نظر ہے۔

(۴) جو نظریہ اوپر پیش کیا گیا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ احکام تحدید ازدواج کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نکاح نہیں کیا۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ احزاب کی آیت پچاس کا اشارہ کس استثناء کی طرف ہے۔ مثلاً مولانا مودودی صاحب پوچھتے ہیں "ان آیات کا آغاز ہی اس ارشاد سے ہوا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الّٰتِیْٓ اٰتَیْتَ اُجُوْرَھُنَّ۔ سوال یہ ہے کہ یہ بات آخر کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ جو عورتیں

---

[۹] تفسیر القرآن از مولوی انشاء اللہ صاحب ص ۲۷۱ / [۱۰] الاستیعاب جلد ۲ - ص ۱۲۵۶ - [۱۱] اصابہ - جلد ۳ - ص ۵۷۷

[۱۲] سنت کی آئینی حیثیت۔ ص ۳۰۱۔

آپ کی بیویاں بن چکی ہیں اور جن کے مہر بھی آپ دے چکے ہیں ان کو ہم نے آپ کے لئے حلال کر دیا۔ آخر اس زمانے میں ہزاروں آدمی اور موجود تھے جو شادی شدہ تھے۔ ان کے لئے کیوں نہ کہا گیا کہ ان سب کی بیویاں ان کے لئے حلال کر دی گئی ہیں؟[13] مختصراً عرض ہے کہ جن مسلمانوں کے پاس چار سے زیادہ بیویاں تھیں، احکام تحدید ازدواج کے بعد وہ زاید بیویاں ان کے لئے حلال نہیں رہیں اور انہیں ان کو علیحدہ کر دینا پڑا۔ مگر حضورؐ کے لئے، جن کے عقد میں سے ہجری میں نو بیویاں تھیں، سب کی سب حلال رہیں اور آپ کو کسی کو علیحدہ نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑے سے تامل سے اس استثناء کی معقولیت واضح ہو جاتی ہے کہ سورۂ احزاب کی آیت میں مسلمانوں کو حکم ہے کہ پیغمبر کی بیویوں میں سے کسی سے نکاح مت کرو۔ لہٰذا اگر حضورؐ کسی بیوی کو علیحدہ کر دیتے تو وہ کسی مسلمان سے شادی نہ کر سکتی تھی اور یہ ممانعت بعض حالتوں میں باعثِ حرج ثابت ہو سکتی تھی لیکن اگر شادی کی اجازت ہوتی تو بھی شاہنشاہِ کونینؐ کی رفیقۂ حیات رہنے کے بعد کونسی بیوی کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کے لئے تیار ہوتی؟ اور اگر کوئی ہو جاتی تو وہ دین یا دنیا میں فساد کا موجب بن سکتی تھی یہ ممکن تھا کہ اس کا خاوند اپنی حسبِ منشا احادیث بیان کرنے پر اسے مجبور کرتا۔ اگر تعمیل کرتی تو دین میں فتور واقع ہوتا اور اگر نہ مانتی تو گھر کا اطمینان خطرہ میں پڑتا۔ ان حالات میں یہی بہتر تھا کہ حضورؐ کے پاس جو چار سے زاید بیویاں تھیں انہیں علیحدگی پر نہ مجبور کیا جاتا۔ پس ظاہر ہے کہ یہ استثناء حضورؐ کو کوئی سہولت مہیا کرنے کے لئے نہیں کی گئی بلکہ اس کا مدعا امہات المومنینؓ کے وقار اور ملت کے مفاد کا تحفظ تھا۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کے بارے میں علماء کا موقف مولانا مودودی صاحب کی اس تحریر سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "اس آیت (احزاب: ۵۰) سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کچھ احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص ہیں جس میں امت کے دوسرے لوگ آپ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ قرآن اور سنت کے تتبع سے ایسے متعدد مقامات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کے لئے نماز تہجد فرض تھی باقی تمام امت کے لئے وہ نفل ہے۔ آپ کے اور آپ کے خاندان والوں کے لئے صدقہ لینا حرام ہے اور کسی دوسرے کے لئے وہ حرام نہیں۔ آپ کی میراث تقسیم نہ ہو سکتی تھی۔ باقی سب کی میراث کے لئے وہ احکام ہیں جو سورۂ نساء میں بیان ہوئے ہیں۔ آپ کے لئے چار سے زیادہ عورتیں حلال کی گئیں۔ بیویوں کے درمیان عدل آپ پر واجب نہیں کیا گیا۔ اپنے نفس کو ہبہ کرنے والی عورت سے بلا مہر نکاح کرنے کی آپ کو اجازت ہو گئی اور آپ کے بعد آپ کی بیویاں تمام امت پر حرام کر دی گئیں۔ ان میں کوئی خصوصیت ایسی نہیں ہے جو حضورؐ کے علاوہ کسی مسلمان کو حاصل ہو۔[14]

ذرا سے غور سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کئی خصوصیات حضورؐ کو کوئی سہولت مہیا کرنے کی بجائے آپ پر مزید بار ڈالتی ہیں۔ نماز تہجد، حرمتِ صدقہ، تقسیمِ میراث سب اسی زمرہ میں آتی ہیں۔ بیویوں کے درمیان عدل آپ پر واجب نہیں کیا گیا اور مہر ادا کئے بغیر شادی کرنے کی آپ کو اجازت دی گئی۔ لیکن مولانا صاحب خود معترف ہیں کہ یہ اختیار پا لینے کے بعد بھی حضورؐ نے تمام ازواج کے درمیان پورا پورا عدل فرمایا کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی اور باقاعدہ باری مقرر کر کے آپ سب کے ہاں تشریف لے جاتے رہے۔[15] اور ہبہ کی اجازت کی بنا پر آپ نے شوال ۷ ہجری میں حضرت میمونہؓ کو اپنی زوجیت میں لیا لیکن آپ نے پسند نہ کیا کہ مہر کے بغیر آپ ہبہ سے فائدہ اٹھائیں۔[16] باقی رہ گئیں دو خصوصیتیں۔ ایک یہ کہ آپ کی بیویاں امت پر حرام کر دی گئیں اور دوسری یہ کہ آپ کے لئے چار سے زیادہ بیویاں حلال کی گئیں۔ اوپر دکھا چکا ہوں کہ آپ کی بیویوں کا امت پر حرام کرنا ایک ایسی احتیاط تھی جس کے بغیر امت کے اہم مقامات کی نگہداشت نہیں ہو سکتی تھی نیز اس ممانعت کا مدعا حضورؐ

۱۳ه مراسلہ بنام راقم نمبری ۷۶/۲۵ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء۔ ۱۴ه تفہیم القرآن۔ جلد ۴۔ صفحہ ۱۱۵۔ نوٹ ۸۹ ۱۵ه ایضاً۔ صفحہ ۱۱۶۔ نوٹ ۹۱
۱۶ه ایضاً۔ صفحہ ۱۱۵۔ نوٹ ۸۸

کو کوئی سہولت مہیا کرنا نہ تھا بلکہ امہات المومنین کے وقار اور ملت کے مفاد کا تحفظ تھا۔ چار سے زیادہ بیویوں کی حلت کے اگر یہ معنی لئے جائیں کہ چار سے زیادہ بیویوں کو طلاق دینا حضورؐ کے لئے لازم نہیں رہا تو یہ آپ کی بیویوں کو امت پر حرام کرنے کا لازمی نتیجہ تھا اور عقل سلیم اس کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتی لیکن اگر اسے یہ معنی پہنائے جائیں کہ احکام تحدید ازواج کے بعد بھی حضورؐ چار بیویاں ہوتے ہوئے نئے نکاح کر سکتے تھے تو اس کے حق میں دلائل قاطع پیش کرنا ممکن نہیں۔ نیز اس قسم کی امتیازی سہولت شان پیغمبری کے شایاں نہ ہوگی اور نہ ہی اس سے فائدہ اٹھانا دوسری نصوص کے بارے میں حضورؐ کے عمل کے مطابق ہوگا۔ لہٰذا اس قسم کی کمزور تاویل سے احتراز ہی اچھا ہے۔

(۶) بحث ماسبق میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ سورہ نساء کی آیت تحدید ازواج ۵ھ میں نہیں بلکہ ۷ھ کے اواخر میں نازل ہوئی تھی۔ اس نظریہ کی تائید میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ۵ھ اور اس سے قریب پہلے زمانہ کے حالات کچھ ایسے تھے کہ بیویوں کی تعداد کو محدود کرنا ملت کے حق میں نہ تھا اور اس تحدید کے لئے مناسب وقت فتح خیبر کے بعد ہی تھا۔ نیز یہ بھی عرض کیا گیا کہ احقر کو کسی ایسی بات یا واقعہ کا علم نہیں ہے جو پیش کردہ نظریہ سے متصادم ہو۔ لہٰذا اسے قبول کرنے سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ بلکہ غیر مسلموں کے اعتراض کا ایک معقول جواب مل جاتا ہے۔ کئی سال ہوئے سر سید احمد خان نے اس مسئلہ کو انہی خطوط پر حل کرنے کے لئے قلم اٹھایا تھا۔ مگر افسوس داعی اجل نے انہیں مضمون ختم کرنے کی مہلت نہیں دی تاہم ان کا یہ نا تمام مضمون میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوا ہے۔

—————(۶)—————

طلوعِ اسلام

ہماری مشکوک تاریخ اور وضعی روایات نے حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کو جس قدر داغدار کر دیا ہے ان میں سے کسی داغ کو صاف کرنے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے وہ مستحق تبریک و تحمید سمجھی جائے گی۔ محترم سید یعقوب شاہ صاحب کے اس مقالہ کا محرک یہی جذبہ ہے اور اسی جذبہ کے ماتحت اسے طلوع اسلام میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(۲) جیسا کہ طلوع اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم اور سیرت رسالتمآبؐ اور صحابہ کبارؓ پر جس قدر اعتراضات غیر مسلموں کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے خود ہمارے (مسلم) نوجوانوں کے دل میں بھی شکوک پیدا ہو جاتے ہیں ان سب کی بنیاد ہماری تاریخ ہے ــــ تاریخ میں کتب روایات بھی شامل ہیں اور کتب سیر و تاریخ بھی ــــ تاریخ کوئی بھی ہو ویسے بھی کچھ .... اعتماد کے قابل نہیں ہوتی لیکن ہماری تاریخ کا تو یہ عالم ہے کہ حدیث کی مستند ترین کتاب ــ مجموعہ امام بخاریؒ ــ رسول اللہؐ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد مرتب ہوئی۔ اور تاریخ کی مستند ترین اور جامع کتاب ــ طبری ــ قریب تین سو سال بعد ــ اور یہ سب کتابیں بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے زبانی روایات کی بنا پر مرتب ہوئیں۔ جو تاریخ کسی عہد کے دو اڑھائی سو سال بعد مدون ہوئی ہو اور مدون بھی ہوئی ہو زبانی روایات کی بنا پر، وہ جس قدر قابل اعتماد ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ چونکہ اس وقت ہمارے پیش نظر اپنی تاریخ پر تنقید نہیں اس لئے ہم اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ (جو حضرات تفصیلی معلومات چاہتے ہوں وہ پرویز صاحب کی کتاب ــ سلیم کے نام خطوط جلد سوم میں متعلقہ موضوع کا مطالعہ فرمالیں)۔ اس وقت ہم صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ صدر اول کی تاریخ میں،

ہجرت اور حضورؐ کی وفات کے واقعات ایسے ہیں جو ہر لحاظ سے نہایت اہم بھی ہیں اور ایسے بھی جن کا علم عام ہونا چاہیئے۔ ان ہر دو مہتم بالشان واقعات کے وقت حضورؐ کی عمر کتنی تھی؟ دیکھئے کہ تاریخ میں اس کے متعلق کس قدر تضادات ہیں۔ طبقاتؔ ابن سعد، طبریؔ سے بھی پہلے کی تالیف ہے۔ (اس کا زمانہ تدوین ۲۳۰ھ کے لگ بھگ سمجھنا چاہیئے)۔ دیکھئے اس میں (اور طبری میں) اس سلسلہ میں کیا لکھا ہے۔

۱۔ ہجرت کے وقت حضورؐ کی عمر شریف

(۱) حضرت سعید ابن المسیبؓ کی روایت کے مطابق، آپؐ تینتالیس سال کے تھے جب آپؐ پر قرآن نازل ہونا شروع ہوا اور آپؐ دس سال مکہ میں رہے۔

(۲) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آپؐ (نزولِ قرآن کے بعد) پندرہ برس مکہ میں رہے اور دس سال مدینہ میں۔ انہی کی دوسری روایت یہ ہے کہ آپؐ (نزولِ قرآن کے بعد) تیرہ برس تک مکہ میں رہے۔

(۳) حضرت ابو رجاء سے مروی ہے کہ انہوں نے حسنؓ سے سنا کہ رسول اللہؐ (نزولِ قرآن کے بعد) آٹھ برس مکہ میں رہے۔

طبری نے بھی ان متضاد روایات کو اپنے ہاں بیان کیا ہے۔

۲۔ وفات کے وقت حضورؐ کی عمر شریف

(۱) حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ جب آپؐ نبی بنائے گئے تو آپؐ کی عمر چالیس سال کی تھی۔ آپؐ دس سال مکہ میں رہے اور دس سال مدینہ میں۔ اس طرح وفات کے وقت آپؐ کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔

(۲) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ وفات کے وقت آپؐ کی عمر تریسٹھ برس کی تھی اور انہی کی دوسری روایت ہے کہ وفات کے وقت آپؐ کی عمر پینسٹھ برس کی تھی۔

یا مثلاً حضرت فاطمہؓ کی وفات کے متعلق تاریخ میں ہے کہ وہ حضورؐ کی وفات کے بعد صرف تین دن زندہ رہیں، یا ایک ماہ، دو ماہ، تین ماہ، چار ماہ۔ اور بعض کے نزدیک چھ ماہ (دیکھئے سیرۃ النبی علامہ شبلی جلد دوم۔ صفحہ ۲۲۴ حاشیہ)۔

حضرت سودہؓ کے متعلق واقدی نے لکھا ہے کہ انہوں نے ۵۴ھ میں وفات پائی۔ اور امام بخاری نے لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں وفات پائی۔ (یعنی ۲۳ھ سے پہلے)۔

آپ غور فرمائیے کہ جب ایسے اہم اور نمایاں امور کے متعلق بھی ہماری تاریخ کا یہ عالم ہے تو دیگر امور کے متعلق اس سے کیا کچھ ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔۔۔ اور یہ تو پھر بھی حوادث اور وقائع ہیں۔ اس تاریخ سے قرآن کی آیات کا سنِ نزول اور شانِ نزول متعین کرنا، مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

ایسے امور کے متعلق جن کا اثر دین کے محکمات، ہمارے بنیادی عقائد، یا حضورؐ کی سیرت طیبہ پر نہ پڑتا ہو، تاریخ سے استناد کچھ بھی کچھ زیادہ مضر نہیں ہو سکتا۔ لیکن جن امور کا ان باتوں پر اثر پڑتا ہو اور ان میں حضورؐ کی سیرت مقدسہ کا مقام خاص طور پر نازک ہے، ان کا فیصلہ تاریخی بیانات کی روشنی میں کرنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ اسی بنا پر اپنی تاریخ کے متعلق ہمارا موقف یہ ہے کہ اس میں سے ان واقعات و اخبار کو صحیح تسلیم کیا جائے جو قرآنی تعلیم کے خلاف نہ ہوں اور جن سے حضورؐ نبی اکرم اور صحابہؓ کبار کی سیرت پر کوئی اعتراض نہ وارد ہوتا ہو۔ جو باتیں اس کے خلاف ہوں، انہیں مسترد کر دیا جائے اور دنیا کو بتا دیا جائے کہ اس تاریخ کی صحیح پوزیشن یہ ہے۔ اس سے آپ دیکھیں گے کہ ہم ان اعتراضات

سے کس طرح محفوظ رہتے ہیں جو محض تاریخ کی غلط بیانی یا عدم احتیاط کی بنا پر اسلام پر وارد کئے جاتے ہیں۔

لیکن ہمارے ہاں مصیبت یہ ہے کہ تاریخ کو ایسا مقدس مقام عطا کر دیا گیا ہے کہ اس پر کسی قسم کی تنقید کو الحاد اور ارتداد قرار دے دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ اس بات کو بطور مسئلہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی۔ پرویز صاحب نے بڑی کاوش سے یہ ثابت کیا کہ یہ روایت غلط ہے۔ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ اور انیس سال کے درمیان تھی۔ یہ کتنی بڑی قابلِ تحسین تحقیق تھی۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس پر اظہارِ اطمینان کیا جاتا، ان پر کفر کے فتوے عاید کر دیئے گئے کہ یہ انکارِ حدیث ہے۔ انکارِ حدیث اس لئے کہ اس سے بخاری کی روایت کو غلط قرار دینا پڑتا ہے۔ یعنی ان حضرات کا مسلک یہ ہے کہ اگر حضورؐ کی سیرتِ طیبہ پر (معاذ اللہ) طعن پڑتا ہے تو پڑتا ہے، بخاری کی روایت غلط نہ قرار پا جائے!

ہمارے نزدیک جب حضورؐ کے تعددِ ازواج کے مسئلہ کو قرآن کریم کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ یعنی

(۱) حضورؐ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہیں تھا۔

(۲) تعدادِ ازدواج کے متعلق قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ حضورؐ کے لئے کوئی استثناء کی گئی تھی۔

(۳) ازواجِ مطہرات کی تعداد ایک سے زیادہ ضرور تھی لیکن قرآن نے کہیں یہ نہیں بتایا کہ بیک وقت حضورؐ کے نکاح میں کتنی ازواج تھیں۔

(۴) ان حقائق کی روشنی میں یہ بات پورے اطمینان اور وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ تحدیدِ ازدواج کا حکم نازل ہونے کے وقت (جس کا زمانۂ نزول قرآن نے نہیں بتایا) اگر حرمِ نبوی میں چار ازواج تھیں تو اس کے بعد آپؐ نے ان میں اضافہ نہیں فرمایا تھا۔ اور اگر چار سے زاید تھیں تو انہیں چھوڑا نہیں گیا ہوگا کیونکہ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا تھا کہ جن کے ہاں چار سے زاید بیویاں ہیں انہیں نکال دیا جائے۔

یہ ہے قرآنی روشنی میں صحیح پوزیشن۔ اگر تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے (جیسا کہ ثابت کرنے کی محترم مقالہ نگار نے کوشش کی ہے) تو ھوالمراد۔ اور اگر وہ اس کے خلاف جاتی ہے تو ہم اس کے بیان کو پرِکاہ جتنی وقعت بھی نہیں دیتے۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان قرآن پر ہے، انسانوں کی مرتب کردہ تاریخ پر نہیں۔ اور جب بھی قرآن اور تاریخ میں ٹکراؤ ہوگا تو ہم قرآن کو مانیں گے، تاریخ کو نہیں۔

(بقیہ)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور۔ ہر اتوار۔ صبح ۹½ بجے
بمقام - ۲۵/بی گلبرگ ٹ۔ لاہور

کراچی ہر اتوار صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ)
بمقام: دفتر بزمِ طلوعِ اسلام
۱/۳ فردوس مارکیٹ (بالمقابل بس سٹاپ) پہلی چورنگی۔ ناظم آباد کراچی ۱۸